۷۸۶

یعنی

ترجمانِ حقیقت سر ڈاکٹر محمد اقبال کے اردو کلام کا مجموعہ

جس کے ساتھ ان کی

(۱) زندگی کے حالات (۲) شاعری کی خصوصیات اور (۳) تصانیف کی تصریحات ہیں

دیباچہ (۱۳۶) صفحوں پر مشتمل ہے
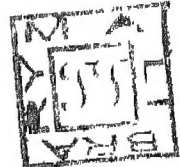
مرتبہ

عالیجناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب ایچ سی ایس

اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل سلطنت آصفیہ

مطبوعہ

عماد پریس حیدرآباد دکن

۱۳۴۳ ہجری

حجم (۳۹۶) صفحے

سخن ہائے گفتنی

(۱) دیباچے کے مسودے میں کچھ اختصار اور تصرف کیا گیا ہے جب اس کے آخری اوراق طبع ہو رہے تھے
اس وقت دو چار ترمیم شدہ نظمیں ان نظموں کے عوض چھپوا دی گئیں جو "خصوصیاتِ شاعری" کے ضمن میں
ابتداءً درج کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ اور سب نظمیں بالکل اسی طرح چھپی ہیں جیسی کہ رسالہ مخزن اور
اخبار زمیندار میں طبع ہوئی تھیں۔

اقبال کا مضمون موضوع شاعری پر ترقی سے اور عجمیت پر خط آئینہ سے ماخوذ ہے

(۲) نظموں اور شعروں کے انتخاب میں ہر سخنور اور ہر سخن فہم کے مذاق کا خیال رکھا گیا ہے۔ ارتقائے کلام کا
جو صاحبانِ طبعِ سلیم مطالعہ کرنا چاہیں ان کے واسطے بھی مواد موجود ہے۔

(۳) اس کتاب میں رسم الخط کا خاص اہتمام مدِ نظر تھا اور کوشش کی گئی تھی کہ یہ صحیح چھپے لیکن اس کا
التزام کماحقہٗ قائم نہ رہ سکا کیونکہ کتاب کا بڑا حصہ برادر محترم کی غیر موجودگی اور عدم نگرانی میں طبع ہوا

(۴) برادر ممدوح کی صحت اچھی رہتی تو یہ مجموعہ کئی مہینے پیشتر نکل چکا ہوتا۔

(۵) علامہ عبداللہ العمادی کی پاکیزہ تقریظ نے اس کتاب کی بسم اللہ ہوئی ہے بعض اور بزرگوں نے اور کرم فرماؤں نے
حوصلہ افزا تقریظیں لکھی ہیں چنانچہ ایک بزرگ کلیاتِ اقبال کی تعریف کرتے ہوئے برادر محترم کی نسبت
ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ہم اس سے تو آگاہ تھے کہ مولوی عبدالرزاق صاحب نے علی گڈھ کالج میں کیمیا، ریاضیات، طبیعیات
اور دینیات میں اور اس کے بعد نظام کالج میں قانون اور اقتصادیات میں مہارت تامہ حاصل کی تھی
اور یہ کہ آج کل وہ سلطان دکن (سرکار نظام حیدرآباد) خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے متوسلین میں ہیں

سلسلے کیلئے ملاحظہ ہو صفحہ (۳) تکمیل

صحت نامہ کلیاتِ اقبال

صفحہ	سطر	کیا نہ ہونا چاہئے	کیا ہونا چاہئے	صفحہ	سطر	کیا نہ ہونا چاہئے	کیا ہونا چاہئے
		(۱) فہرست و تقریظ و تقریب		۷۱	۱۳	وہ اپنی شاعری	حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری
				۷۹	۱۰	حیات تازہ داری	حیات تازہ دادی
۵	۱	مضمون۔ مضمون	نظم۔ نظم	۸۲	۹	وجھوم	وہ جھوم
۱۴	۷	حصۂ نثر	دیباچے کے	۸۴	۸	روح رواں	روح درواں
۱۶	۸	گھبراتا ہوں	گھبرایا ہوں	۸۴	۱۵	مضمون	مضمر
		(۲) دیباچہ		۹۶	۷	غیر مطبوعہ ہے	غیر مطبوعہ تھا
۴	۱۴	تو ایک	تو یہ ایک	۱۰۲	۱۵	جستہ	جستہ
۱۱	۲	سنہ ۱۹۰۹ء	سنہ ۱۹۰۵ء	۱۲۰	۴	کوسے مار	کوٹے یار
۱۴	۱۰	کب تک	جب تک	۱۲۷	۱۱	انسان	انساں ہے
۱۴	۱۱	جنوں نے	جنھوں نے	۱۳۶	۱۳	سمجھے	سمجھا
۱۹	۹	یہ ممکن نہیں	لیکن یہ ممکن نہیں			(۳) حصہ نظم	
۲۰	۱۰	یہاں	بیاں	۲	۴	اک نگہ میں	اے نگاہ
۲۱	۱۲	خوشی میں	خوشی نے	۲	۱۴	تبسم	تبسم
۲۳	۷	ہند میں... ادبار کی نکہت کی	ہند پر... ادبار اور نکہت کی	۳	۱۴	مرا تمنائی	تیرا تمنائی
۲۴	۱۲	ترک لازمت	ترک ملازمت (فٹ نوٹ نمبر ۱)	۴	۴	اس پر	اسیر
۲۷	۱۰	ملتی جاتی	ملتی جلتی	۷	۸	درور کہتے ہیں	درد کہتے ہیں
۳۱	۱۵	مرزا داغ دہلوی	مرزا داغ دہلوی کو	۹	۱	خوش	چپ
۳۲	۱۲	انداز ہیں	انداز ہیں	۹	۳	تری	مری
۳۹	۱	بالی انت والی	بالی انت والی	۹	۱۰	اچھا کہا	اچھی کہی
۴۰	۱۲	مات کر دی	مات کر دیا	۹	۱۵	ملک وستے ہیں	ملک روتے ہیں
۴۴	۹	انگشت	گشت	۱۰	۳	پہچانو	پہچانو
۴۴	۱۱	نہیں بلکہ	نہیں ہے بلکہ یہ	۱۰	۲	جانتا ہے	جانتا ہوں
۴۴	۱۲	واسطے نیر سہارنپ	واسطے بھی نیر سہارنپ	۱۰	۱۰	نہیں	جنہیں
۴۸	۹	معتمد الیہ	معتمد علیہ	۱۱	۲	چھپایا	چھپایا
۵۶	۶	لا یہ	الآیہ	۱۲	۵	میرے مال	اپنے مال
۵۶	۱۰	لیسمون	لیستمون	۱۷	۴	فلک کا سفر	فلک کو سفر

صفحہ	سطر	کیا نہ ہونا چاہئے	کیا ہونا چاہئے	صفحہ	سطر	کیا نہ ہونا چاہئے	کیا ہونا چاہئے
۱۷	۵	دیا جہاں کو	دیا جہاں کو				جلد آجاتا ہے غصہ جلد
۱۸	۵	نہیں کہیں	کہیں نہیں				من جاتا ہوں میں
۲۰	۵	پر آشوبی	دیر آشوبی	۴۱	۱۵	لبھاتا ہے	لبھا لیتا ہے
۲۱	۱۰	شوخی بھی ہے	شوخی سی ہے	۴۲	۱۱	کہسار ہیں	کہسار ہیں
۲۵	۴	تو تیا	تو تیا	۴۲	۱۴	اٹھا لے آنا	اٹھا نے آنا
۲۸	۵	سبھا	سبھا ہیں	۴۷	۹	ذرا	مرا
۲۹	۶	بل	پل	۴۷	۱۱	چھپتے	چھپتے
۳۰	۹	کسب نلک	کسب تک	۴۹	۹	مصر روما	مصر و روما
۳۲	۱۲		اس شعر کو قلم زد کر دیجئے	۵۱	۷	آگ سے	آگ سا ہیں
۳۴	۳	پادشاہی	پادشائی	۵۱	۱۱	قطرۂ نایاب	قطرۂ بے تاب
۳۴	۶	تخلف	بخلف	۵۲	۳	زنداں	زندہ دل
۳۶	۷	رربان	ریوال	۵۴	۱۳	شمس و قمر	سو شمس و قمر
۳۷	۲	خاموشی ہے	خاموشی ہی	۵۵	۷	جوانی کی بہاں	جوانی کی نہاں
۳۷	۷	قدرتہ خانہ	خلوت خانہ	۵۹	۴	پیچیدہ تر از زلف ایماز	پیچیدہ تر از زلف ایاز
۳۷	۹	بہر آئی	لہرائی				بعض نسخوں میں صحیح
۳۸	۲	دور کی	اوسائی				چھپا ہے۔
۳۸	۵	نقش ہستی	نفی ہستی	۶۲	۱۱	کا آشیانا	کا آب و دانا
۳۹	۱۳	دررود	دورود	۶۵	۷	اس کا پھل	جس کا پھل
۴۱	۱۴	جلد آجاتا ہے غصہ جلد	تو تلون آشنا ہے	۶۶	۱۰	وحدت کا راگ	وحدت کا گیت
		من جاتا ہوں میں	بھی تلون آشنا	۶۷	۳	لے	نے
			اس کے بعد یہ	۷۰	۲	جگر و شیشہ	جگر شیشہ
			شعر درج ہو	۷۳	۱۴	آشنا رہیں	آثار ہیں
			عارضی لذت کا شیدا ہی	۷۵	۱۳	درود	درود
			ہوں جلا جاتا ہوں	۷۸	۲	غنچۂ گل	غنچۂ دل

غلط نامہ

صفحہ	سطر	کیا نہ ہونا چاہئے	کیا ہونا چاہئے	صفحہ	سطر	کیا نہ ہونا چاہئے	کیا ہونا چاہئے
۸۲	۱۰	بلبل	کویل	۱۲۵	۲	عیش	نیش
۸۵	۳	خون ہیں	خون ہے	۱۲۸	۱۰	لعل	لال
۸۶	۵	اور ان کی	اوروں کی	۱۳۵	۳	صہباد آب	صہباد آب
۸۶	۱۰	رسیدہ بو	رسیدہ بو	۱۳۷	۹	کہہ رہا ہے	کر رہا ہے
۸۷	۱۴	غم دم نہ کر	غم رم نہ کر	۱۴۱	۱۵	ہامجو خود	ہامجو سے
۸۸	۱۳	حوالی	حوالی	۱۴۳	۷	تجھ	مجھ
۹۱	۹	دیدہ انسان نامحرم	دیدۂ انسان سے نامحرم	۱۴۴	۹	منزل تیری	منزل میری
۹۸	۷	ہے	ہیں	۱۴۵	۴	ہاں سلام اے مولد بوذاسف گوتم تجھے	ہاں سلام آخری اے مولد گوتم تجھے۔
۱۰۱	۴	شاہ ہستی	شانۂ ہستی				
۱۰۱	۳	شاہد شب	ساحر شب	۱۴۵	۸	فراق انگیز	فراق آمیز
۱۰۳	۱۱	ان کی والدہ	ان کے والد	۱۴۵	۱۱	.... انسان ہا ہیں	.... انساں ہیں یہ
۱۰۶	۱۱	مل رہی تھی	ہو رہی تھی	۱۴۵	۱۱	.... نادان ہا ہیں	.... ناداں ہیں یہ
۱۰۸	۱۲	ٹھنکر	نیکر	۱۴۵	۱۲	موجہ ساحل	موجہ وساحل
۱۱۳	۴	نور پیکر گر	جور پیکر گر	۱۴۵	۱۴	جاں رہین رنج	جاں رہین رنج
۱۱۶	۴	دامن تہیں تخیل	دامِ تہین تخیل	۱۴۵	۱۵	سلجھائے	الجھائے
۱۱۶	۸	جہاں سے خاصے	وہاں بے حاصلی	۱۴۶	۴	تصویریں	تفسیریں
۱۲۰	۹	جو	جوں	۱۵۴	۹	ترا نظارہ	نرا نظارہ
۱۲۰	۱۰	مرا دعا	مری دعا	۱۵۵	۳	بج	بیج
۱۲۱	۱۲	قم باذنی نے	قم باذنی سے	۱۵۵	۷	چشم ساغر	چشم شاعر
۱۲۲	۴	خواب میں	خواب سے	۱۵۵	۱۰	ہے استغنا کہ	یہ استغنا ہے
۱۲۳	۶	دم آہو	رم آہو	۱۵۹	۱۱	نغمہ صدا لے	نغمہ سرائے
۱۲۳	۷	نظارتا	نظارہ	۱۶۰	۱۵	اخر	آخر
۱۲۳	۱۰	میرے ہاتوں	تیرے ہاتوں	۱۷۰	۱۴	جس جا پہ	جس جا پر
۱۲۳	۱۴	نانٹ ان گیل	ناٹنگیل	۱۷۶	۲	کبھی	کہیں

صفحہ	سطر	کیا نہ ہونا چاہیے	کیا ہونا چاہیے	صفحہ	سطر	کیا نہ ہونا چاہیے	کیا ہونا چاہیے
۱۷۷	۱۱	راوسے	راہ سے	۲۱۵	۶	خال	خاکی
۱۷۹	۱۰	لے دے کر	لے دے کے	۲۲۰	۹	پاک ہیں	پاک ہیں
۱۸۳	۱۱	مال وجہاں	مال جہاں	۲۲۱	۱	کامل	کابل
۱۸۵	۱	دشت ہیں	دشت ہیں	۲۲۳	۳	بنالیتی ہیں	بنالیتی ہے
۱۸۸	۷	ورد	دور	۲۲۳	۱۱	بن کے گہر	بن کر گہر
۱۹۶	۱	خود گذاری	خود گدازی	۲۲۳	۱۲	رہ گزر ہیں	رہ گزر ہیں
۲۰۳	۳	شاعر...... جائے گا	"شاعر نے اسلام... جیا" دیگا	۲۲۴	۱۵	شہر یارمی	شہر یاری
۲۰۳	۱۲	برنی خیز	برنمی خیزد	۲۲۵	۱۲	قطار آید قطار آمد	قطار آید قطار آمد
۲۰۴	۴	مہتمر	مستقمر	۲۲۵	۱۴	بچشم	بچشم
۲۱۲	۳	دل فروز دل نشیں	دل فروز و دل نشیں	۸۱۴	۶	چشم انگر	چشم احمر
۲۱۳	۴	پردہ طوفاں	پردہ طوفاں				
۲۱۴	۶	اور زوائد بے خبر زنجیر کے کشت تخیل۔	اور آبادی ہیں تو زنجیری کشت تخیل				
۲۱۴	۱۳	ستر آدم	ستر آدم				
۲۱۵	۴	زنگار	زنہار				

نوٹ

علاوہ ازیں (۱) ایک جگہ (۱) ڈ کو د - ڈ کو ڈ - ن کو ں - ں کو ن - ی کو ے اور ے کو ی لکھا گیا ہے ؛ (۲) ضروری نقطے نہیں دئے گئے اور (۳) غیر ضروری نقطے اور اضافتیں لکھی گئی ہیں ۔ ناظرین تصحیح فرمالیں ؎

فہرست کلیاتِ اقبال

چکیدۂ کلکِ جواہر سلکِ علامہ عبداللہ العمادی برکی منصرم ناظر کتبِ مذہبی دارالترجمہ سرکارِ عالی

آج جب کہ ہماری شاعری گرفت وگیر کی نزاکت میں عیارانہ مشاقی پیدا کرنے کے لئے اس طرح کہ گھونگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے" پر زور دے رہی ہے اور جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اُٹھا لو" کے فلسفہ کی عملی تعلیم دینے پر آمادہ ہے "سخن سنجی کو دعوے ہے کہ واعظ کے مونھ پہ مہر لگا دوں کباب کی" اور سخن سنج یہ مستزاد الاپ رہا ہے کہ "ڈاڑھی کو دیا اُس کے لگا بُزِ قطونا۔ اور سمجھنے لگی گت" اس وقت یہ عرض کرنا شاید بے محل نہ ہو کہ ہماری یہی شاعری کبھی ملکی و قومی اغراض کے تابع تھی اور اسلام کی علم برداری کا کام اس نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ انتقام اہل بیتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) "کمیت" نے ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے اثر سے دمشق سے لیکر اندلس تک تلواریں چل جاتی ہیں، دولتِ بنی اُمیہ کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور عباسیوں کے لئے پیش قدمی کا راستہ صاف ہو جاتا ہے

ابراہیم بن المہدی ایک قصیدہ سناتا ہے اور نصرانیت سے اسلام کا انتقام لینے کے لئے تمام بغداد قسطنطنیہ پر چڑھ دوڑتا ہے۔

یہ عربی شاعری کا انداز تھا جس سے افسوس ہے کہ ہمارے تعلقات آج کل دور جا پڑے ہیں لیکن فارسی بھی اس خصوص میں کچھ ایسی پیچھے نہیں دیکھو غزنوی کا دربار گرم ہے عثمان مختاری ایران میں بیٹھا ہوا ہندوستان کے فتوحات نظم کر کے اپنے ایرانیوں کو جہاد کے آمادہ کر رہا ہے، کمال اسماعیل کفر سے بدلہ لینے کی داد دیتا ہے کہ "تو داد منبر اسلام بستدی زصلیب" عمق بخاری زوالِ دولت اصفہان کا مرثیہ کہہ کے قوم میں حرکت پیدا کرنا چاہتا ہے "کہ خاک خوں آلودہ باد با صفاہاں" ظہیر اگرچہ خاندان خوارزمشاہ کا موروثی مداح و نمک خوار ہے مگر خوارزمشاہ جب بغداد پر لشکرکشی کر کے انقلاب خلافت کا ہنگامہ برپا کرنا چاہتا ہے اور شیخ شہاب الدین سہروردی (قدس سرہٗ) کی سفارت کو جو اُس وقت اُسے سمجھانے آئی ہے اپنے زعم میں ذلیل کر کے واپس کرتا ہے تو غیظ و غضب کے عالم میں طنز کے طور پر ظہیر کے اسلامی جذبات اُس کو یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں کہ:۔

شاہا عجم چو گشت مسلّم بہ تیغ تو ‎ ‎ لشکر بسوئے خوابگہ مصطفےٰ فرست

پس کعبہ را خراب کن و ناودان بساز ‎ ‎ خاکِ حرم چو ذرّہ ببوئے ہوا فرست

از کعبہ جامہ باز کن و در خزانہ نہ ‎ ‎ وانگاہ روضہ را دو سہ گز بوریا فرست

"تا کافری تمام شود پس بہ آرزیخ رہ (یعنی تعیبو)

وانگہ سرِ خلیفہ بسوئے خطا فرست"

غزوں کا وحشی گروہ سلطان سنجر کو گرفتار کرکے خراسان کو لوٹ لیتا ہے خراسانیوں میں تو دم نہیں مگر انوری اپنے اہتمام سے ایک سفارت دیتا ہے جس کے صدر امیر کمال الدین بنائے جاتے ہیں اور وہ سمرقند پہنچ کر، جہاں کے حکمران ملک ضیاء الدین ہیں، ایران کی "تباہی پر تورانیوں کو غیرت دلانے کے لئے انوری کا یہ قصیدہ سناتے ہیں" جس کے چند شعر آپ بھی سُن لیں :-

خبرت نیست کہ از ہرچہ در و چیزے بود — درہمہ ایراں امروز نماندست اثر

بر بزرگان زمانہ شدہ خرداں سالار — بر کریمان جہاں گشتہ لئیماں مہتر

بر درِ دوناں احرار حزین و حیراں — در کفِ رنداں ابرار اسیر و مضطر

مسجدِ جامع ہر شہر ستورِ شاں را — پایگاہیست کہ نہ سقفش پیداست نہ در

خطبہ نکنند بہر خطہ بنامِ غز، از انکہ — در خراساں نہ خطیب است کنوں نے منبر

کُشتہ فرزند گرامی و اگر ناگاہاں — بیند از بیم خروشید نیارد مادر

ہست در روم و خطا امن مسلماناں را — نیست یک ذرہ سلامت بہ مسلمانی در

بر مسلماناں زاں گونہ کنند استخفاف — کہ مسلماں نکند صد یک ازاں بر کافر

رحم کن رحم بران قوم که نبود شب و روز | وز نصیبت شان جز نوحه گری کار دگر
رحم کن رحم بران قوم که جویند دوا | از پس آنکه بخوردند از انار و شکر
رحم کن رحم بران قوم که رسوا گشتند | از پس آنکه به زیبائی بودند سمر
رحم کن رحم بر آنها که نیابند نمد | از پس آنکه ز اطلس بودے بستر
وقت آن است که یابند ز جنت نہال | گاه آن است که گیرند ز تیغت کیفر
همه پوشند کفن چون تو بپوشی خفتان | همه خواهند اماں چون تو بیاری مغفر

اُردو اگرچہ بہت دیر کے بعد اس شاہراہِ ملّی پر گرم رو ہوئی ہے مگر اقبال کی قیامت کی چال نے اس تاخیر کی تلافی کر دی اور اب اردو کو بھی یہ کہنے کا موقع ملا کہ "گر دیر آمدہ شیر آمدم شیر" مسلمانوں پر جو وقت اب آپڑا ہے زوالِ تمدنِ عرب کی صدیوں میں بھی کبھی نہیں بلادست و گریباں تھی، شاعری نے اس زمانہ میں بھی تحریکِ بیداری کی سرپرستی کا کام اپنے ذمہ لی تھی مگر یاس اتنا غالب تھا اور قنوط نے فیصلہ کر دیا تھا کہ اب اسلام کی عظمتِ سابقہ تو عود کر سکتی نہیں، مسلمانوں کے پاس جو کچھ رہ گیا ہے یہی بچا رہے تو بہت ہے اُس عہد کی شاعری اسی نظریہ پر مرتب ہے اور کہتی ہے:-

طمع مدار که کفش بشکنند بت‌ها
بس است این که نبندند مومنان زنار

لیکن اقبال کا دل وحیِ الٰہی کا آئینہ دار ہے۔ کشفِ غطاء نے اُس کے سامنے آسمان و زمین کے پردے اُٹھا دیئے ہیں اور اُس کو صاف نظر آرہا ہے کہ سنہ ۵ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نظامی نے مخزنِ اسرار میں جو فریاد کی تھی اُس چودھویں صدی میں وہ دُعا مستجاب ہونے کو ہے۔ توحید کی حق قریب آنے والی عظمت کا نظارہ اس کے روبرو ہے اور وہ "محوِ حیرت ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی" ہر ایک اسلامی زبان کی شاعری میں پیغمبرانہ حیثیت اقبال ہی کے لئے ودیعت تھی اور دنیا بھر میں جو ایک حسانُ الہند ہے جو گوری شنکر (ایورسٹ) سے لے کر پرنیز تک کی چوٹیوں پر اعلائے لوائے نبوی کے لئے قوم کو آمادہ کر رہا ہے۔

ہندوستان کو قدرت کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس کے بہترین فرزند مولوی عبدالرزاق صاحب ایم۔ سی۔ ایس کے جذباتِ قلبی اس مدوّنۂ حکمت و دیوانِ رسالت کو منصۂ شہود پر لا رہے ہیں۵ ....

مورخہ ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۲ ہجری
مطابق ۲۸ جون سنہ ۱۹۲۴ عیسوی

---

۵ اس کے بعد علامہ عمادی نے میری مبالغہ آمیز ستائش شروع کی ہے (جس میں انہوں نے خود اپنا عکس دیکھا ہے) اور مجھ پر بڑی مہربانی ظاہر کی ہے۔ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا (مرتب)

تقریب

دکن کے دارالحکومت سے، سرڈاکٹر محمد اقبال کے اُردو کلام کا یہ مجموعہ کلیاتِ اقبال کے نام کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کی نسبت چند امور کی صراحت ضروری ہے۔

(۱) یہ مجموعہ تقریباً ایک برس سے زیر طبع تھا، اس اثنا میں بہت لوگ مشتاق تھے اور روز بروز تقاضا کرتے تھے کہ یہ مطبع سے جلد نکل آئے، کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنی جگہ پیچ و تاب کھاتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ یہہ کتاب حیدرآباد میں چھپے۔ حقیقت یہہ ہے کہ قدرت کو اس پردے میں بھی اقبال کے حسن قبول کا ثبوت دینا منظور تھا۔

لوگوں کو عام طور پر شاید یہ بات معلوم نہ ہو کہ ہندوستان کے ہر خطے میں چند اصحاب ایسے موجود ہیں جو یا تو حافظ اقبال ہیں یا نہایت شوق سے اقبال کا کلام جمع کرتے ہیں، میں بھی مدت سے ایک بیاض میں ان کی نظمیں جمع کر رہا تھا۔ اس بیاض کو لوگ مجھ سے مانگ کر لے جاتے تھے اور ان کو

فائدہ پہنچانے کی خاطر ہیں اس کے مستعار دینے میں کبھی تامل نہ کرتا تھا لیکن یہ اتفاق ہے گم ہو گئی عجب نہیں جو کسی نے "در کعبہ بدزد و اگر یابی" پر عمل کیا ہو، اس میں تقریباً دو سو نظموں کے علاوہ جن میں غزلیں بھی شامل تھیں اور بہت سا بکار آمد مواد تھا مثلاً

(۱) کونسی نظم کس سنہ میں لکھی گئی، کب کس موقع پر اور کہاں پڑھی گئی۔

(۲) کونسی نظم ہندوستان سے گذر کر دنیا کے کس کس ملک میں پہنچی، وہاں اس کا ترجمہ کس زبان میں اور کس رسالے یا اخبار میں شائع ہوا، اور اس پر کس کس نے تنقید کی

(۳) نظم لکھنے کے کونسے اسباب محرک ہوئے۔

(۴) نظم کی بنیاد کلام مجید کی کس آیت یا فلسفہ کے کس مسئلہ پر ہے۔

(۵) نظموں سے متعلق معتبر روائتیں کیا کیا ہیں۔

اس کی توضیح میں چند مثالیں اپنی یاد سے لکھتا ہوں :-

(۱) ۱۹۱۲ء میں انجمن حمایت اسلام کے اس اعلان پر کہ اقبال اپنی بہترین نظم "شمع اور شاعر" پڑھیں گے لاہور میں آٹھ نو ہزار آدمی جمع ہو گئے تھے، نظم پڑھنے سے پہلے اقبال اہل جلسہ سے ذرا الگ بیٹھے ہوئے ایک خرقہ پوش کے ساتھ باتیں کر رہے تھے، ان کی تلاش میں ایک دوست اس جگہ پہنچے اور کچھ کہتے ہوئے انہیں ان کی نشست مقررہ پر لے گئے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر کے "شمع اور شاعر"

شروع کرنے سے پہلے اقبال نے یہ شعر پڑھے:-

ہم نشینِ بے ریا یم از رہِ اخلاص گفت　　　اے کلامِ تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر
درمیانِ انجمن معشوقِ ہرجائی مباش　　　گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر
گفتمش اے ہمنشیں معذور می دارم ترا　　　در طلسمِ امتیازِ ظاہری ہستی اسیر
من کہ شمعِ عشق را در بزمِ دل افروختم　　　سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم

شمع اور شاعر میں کیا فلسفہ ہے اور وہ قرآن کریم کی کس آیت کے تابع ہے حصہ نثر صفحہ (۱۰۴) کے ملاحظہ سے معلوم ہوگا۔

(۲) ایک دفعہ ان کو ایک ناگہانی تکلیف پیش آگئی تھی تو یہ نظم کہہ کر حضرت خواجہ نظام الدین قدس سرہ کے مزارِ مبارک پر پڑھی تھی۔ ان کی صعوبت مبدل براحت ہوئی۔ اہلِ طریقت ایک فلسفی کے یہ شعر دلچسپی سے دیکھیں گے۔

کیوں نہ ہوں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے　　　طور دل آغوش ہیں ذرے تری درگاہ کے
میں تری درگاہ کی جانب جو نکلا لے اڑا　　　آسماں تارے بنا کر میری گردِ راہ کے
ہے زیارت کی تمنا المدد اے سوزِ عشق　　　پھول لا دے مجھ کو گلزارِ خلیل اللہ کے
شانِ محبوبی ہوئی ہے پردہ دارِ شانِ عشق　　　ہائے کیا رتبے ہیں اس سرمایۂ ذی جاہ کے
تر جو تیرے آستانے کی تمنا میں ہوئی　　　اشک موتی بن گئے چشمِ تماشا خواہ کے

رنگ اس درگہ کے ہر ذرّے میں ہے توحید کا ۔۔۔ طائرانِ بام بھی طائر ہیں بسم اللہ کے

چھپ کے ہے بیٹھا ہوا اثبات نفیِ غیر میں ۔۔۔ لا کے دریا میں نہاں موتی ہیں الا اللہ کے

سنگِ اسود تھا اگر سنگِ فسانِ تیغِ عشق ۔۔۔ زخم میرے کیا ہیں دروازے ہیں بیت اللہ کے

عشق اس کو بھی تری درگاہ کی رفعت سے ہے ۔۔۔ آہ یہ انجم نہیں آنسو ہیں چشمِ ماہ کے

تیرے ناخن نے جو کھولی سیمِ احمد کی گرہ ۔۔۔ کھل گئے عقدے جہاں میں ہر خدا آگاہ کے

میرے جیسے بے نواؤں کا بھلا مذکور کیا ۔۔۔ قیصر و فغفور درباں ہیں تری درگاہ کے

محوِ اظہارِ تمنائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا کہ میں اقبال[۱] کا ہمنام ہوں

سہمی پھرتی ہے شفا میرے دلِ بیمار سے ۔۔۔ اے مسیحا دم بچا لے مجھ کو اس آزار سے

اے ضیائے چشمِ عرفاں اے چراغِ راہِ عشق ۔۔۔ تنگ آیا ہوں جفائے چرخِ ناہنجار سے

سینۂ پاکِ علی حزیں کا امانت دار تھا ۔۔۔ اے شہِ ذی جاہ تو واقف ہے اُن اسرار سے

[۲] ہند کا داتا ہے تو تیرا بڑا دربار ہے ۔۔۔ کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربارِ گوہر بار سے

اک نظر میں خسروِ ملکِ سخن خسرو ہوا ۔۔۔ میں کہیں خالی نہ پھر جاؤں تری سرکار سے

---

۱ محمد اقبال نامی حضرت محبوب الٰہی کے ایک مرید خاص تھے۔
۲ یہ شعر درگاہ کے دروازے پر لکھا ہوا ہے۔

ناک میں بیٹھی ہے بجلی میرے قاتل کے لئے [illegible]

آج کل اصغر جو تھے اکبر ہیں اور مونہ غالب [illegible]

کیا کروں اوروں کا شکوہ لے امیر ناک نقیر [illegible]

کہہ رہے ہیں مجھ کو پر بستہ قفس میں دیکھ کر [illegible]

گریۂ شبنم پہ گل ہنستے ہیں کیا بیدرد ہیں [illegible]

گھات میں صیاد مائل آشیاں سوزی پہ برق [illegible]

کہہ دیا تنگ آکے اتنا بھی کہ میں مجبور تھا [illegible]

سخت ہے میری مصیبت [illegible] ہوں میں

بن کے فریادی تری سرکار میں آیا ہوں میں

کیمیا سے بھی فزوں ہے تیری خاک در مجھے [illegible] مقصود [illegible] مجھے

تو ہے محبوب الٰہی کر دعا میرے لئے یہ مصیبت ہے مثال فتنۂ محشر مجھے

ہو اگر یوسف مراز حمت کشِ چاہِ الم [illegible] مجھے

اس بڑی سرکار کے قابل مری فریاد ہے [illegible] مجھے

میرا کیا منہ ہے کہ اس سرکار میں جاؤں مگر [illegible] رہبر مجھے

واسطہ دوں گا اگر لخت دلِ زہرا کا میں غم [illegible] شافعِ محشر مجھے

رونے والا ہوں شہیدِ کربلا کے غم میں میں / کیا درِ مقصد نہ دیں گے ساقیٔ کوثر مجھے

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغِ عشقِ اہلبیت / ڈھونڈتا پھرتا ہے ظلِّ دامنِ حیدر مجھے

جا ہی پہنچے گی صدا پنجاب سے دہلی تلک / کر دیا ہے گرچہ اس غم نے بہت لاغر مجھے

آہ تیرے سامنے آنے کے ناقابل ہوں میں
منہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں

(۳) ستمبر ۱۹۰۵ء میں ولایت جاتے ہوئے انھوں نے جہاز میں ساحلِ اطالیہ کے قریب یہ غزل لکھی:-

مثالِ پرتوِ مے طوفِ جام کرتے ہیں / یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری / شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا / کہ اک نظر میں جوانوں کو رام کرتے ہیں

غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی / حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں

میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں / جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

ہرے رہو وطنِ مازنیؔ کے میدانو!
جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

؎ اطالیہ کا مشہور محبِ وطن جس کی وطن پرستی کو یورپ سے مراجعت کے وقت اقبال دور سے سلام کرتے ہیں:

اور ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپسی کے وقت جہاز پر سے جب اُن کو جزیرہ سسلی نظر آیا جو کسی زمانہ میں مسلمانوں کی عظمت و سطوت کا مخزن تھا مگر اب اسلامی تہذیب کا مدفن ہے تو اُن کے دل میں اس سے زیادہ تموج پیدا ہوا جو اُن کے سامنے بحیرۂ روم کی موجوں میں تھا۔ اسی تحریک نے اُن سے سسلی کا مرثیہ لکھوایا (حصۂ نظم صفحہ ۴۷)

(۴) ماہ مارچ ۱۹۱۰ء میں اقبال ہندوستان کی وہ اسلامی حکومت دیکھنے آئے تھے جو تیموری جاہ و جلال کی تنہا یادگار ہے اور دُھندلی سی چاندنی میں قلعۂ گولکنڈہ کے قریب قطب شاہی گنبدوں کی زیارت کو گئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی یہ نور کی چادر اوڑھے ہوئے پُرحسرت مقبرے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے کہ "لو! کئی صدیوں کے بعد ہماری شان و شوکت کی عبرت ناک داستاں سنانے والا آپہنچا" ممکن نہ تھا کہ اس کا اثر شاعر کے دل پر نہ ہوتا۔ انہیں تاثرات کی نہایت پاکیزہ تشکیل نظم گورستان شاہی (حصۂ نظم صفحہ ۸۷) ہے جس کا آخری شعر بالعموم ہر ملک کے اور بالخصوص دکن کے مسلمانوں سے کچھ کہہ رہا ہے۔

(۵) ۱۹۱۹ء میں جلیان والے باغ کی یادگار قائم کرنے والوں کو دو شعر (حصۂ نظم صفحہ ۳۳، نکتہ ۳۲) چندے میں دئے گئے۔

(۶) ذیل کے مقطع سے غزل کی تقریب ظاہر ہے (حصۂ نظم صفحہ ۵)

مطلع: ہے سکوں نا آشنا طرحِ جہانِ اہلِ درد — جوں قمر سائر ہے قطبِ آسمانِ اہلِ درد

مقطع: کہہ دیا اقبال اک مصرع نوازش نے جو آج — وہ بہانہ ہو گیا بہرِ بیانِ اہلِ درد

(۷) اس سوال پر کہ شبِ معراج کی اصلیت کیا ہے لسان الاسلام نے یہ جواب دیا

رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں — کہہ رہی ہے یہ مسلمانوں سے معراج کی رات

اخترِ شام کی آتی ہے اُفق سے آواز — سجدہ کرتی ہے جسے صبح وہ ہے آج کی رات

(۸) جنگ یورپ ۱۹۱۴ء-۱۸ء کے نتائج ظاہر کرتے ہوئے فرانس، روس، انگلستان

جرمنی، امریکہ اور ترکی کی قسمتوں اور خصوصیتوں کی یہ تصویر کھینچی -

ہیچ می دانی کہ صورت بندِ ہستی با فرانس — فکرِ رنگیں و دلِ گرم و شرابِ ناب داد

روس را سرمایۂ جمعیتِ ملت ربود — قہر او کوہِ گراں را لرزۂ سیماب داد

ملک و تدبیر و تجارت را با انگلستاں سپرد — جرمنی را چشمِ حیران و دلِ بیتاب داد

تا برانگیزد نوائے حریت از سازِ دہر — صدرِ جمہوریہ امریکہ را مضراب داد

ہر کسے درخورد فطرت از جناب او ببرد — بہرِ ما چیزے نبود و خویش را با ما سپرد

(۹) پنجاب کے دوستوں کے ذریعے مجھے علی گڈھ کالج کی طالب علمی کے ایام

میں اقبال کے زمانۂ نو عمری کی نظمیں بہت سی ملی تھیں - اس کتاب کے مطالعہ کی ابتدا

ہی میں آپ بھی اُن کی یہ ابتدائی مشقیں دیکھ لیں۔

(۱) ترقی تعلیم کے واسطے مسلمانانِ کشمیر کی ایک انجمن قائم ہو رہی تھی تو یہ نظم لکھی گئی

کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزوں — بدن میں جان تھی کہ جیسے قفس میں صید زبوں

جو سامنے تھی مرے قوم کی بُری حالت — انڈ گیا مری آنکھوں سے خون کا جیحوں

ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم — یقیں ہے راہ پہ آئے گا طالعِ واژوں

ہلال وار اگر منہ میں دو زبانیں ہوں — ادا نہ پھر بھی ہو شکر خدائے کن فیکوں

کرم سے اس کے وہ صورت فلاح کی نکلی — کہ حصنِ قوم ہر اک شر سے ہو گیا مصئوں

چراغِ عقل کو روشن کیا ہے ظلمت میں — ہمارے ہاتھ میں آجائے گا دُرِ مکنوں

بڑھے یہ بزم ترقی کی دوڑ میں یارب — کبھی نہ ہو قدمِ تیز آشنائے سکوں

اسی سے ساری امیدیں بندھی ہیں اپنی کہ ہے — وجود اس کا پئے قصرِ قوم مثلِ ستوں

کچھ ان میں شوق ترقی کا حد سے بڑھ جائے — ہماری قوم پہ یارب پھونک دے افسوں

دکھائیں فہم و ذکا وہ ہنر یہ اوروں کو — زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علوم و فنوں

جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں

اسے بھی باندھ لے اقبالؔ صورتِ مضموں

(۲) خواجہ صمد جو رئیس کشمیر بارہ مولا کے فرزند کی وفات پر یہ شعر موزوں ہوئے۔

نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار — نظر سے جو وہ گل نہاں ہو گیا
بڑھا اور اک دشمنِ جاں ستاں — دھواں آہ کا آسماں ہو گیا
کسی نوجواں کی جدائی میں قد — جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا
وہ سرخی ہے اشکِ شفق رنگ میں — حریفِ مئے ارغواں ہو گیا
بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں — وہی نذرِ برقِ تپاں ہو گیا
کروں ضبط اے ہم نشیں کس طرح — کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہو گیا

(۴) مقطع کہہ رہا ہے کہ یہ غزل کس تقریب میں لکھی گئی۔

لڑکپن کے ہیں دن صورت کسی کی بھولی بھولی ہے — زباں میٹھی ہے لب ہنستے ہیں پیاری پیاری بولی ہے
وہ میری جستجو میں پھر رہے ہیں خیر ہو یارب — پتا میرا بتانے کو قیامت ساتھ ہو لی ہے
سمجھ سکتا نہ تھا کوئی مجھے اس بزمِ ہستی میں — گرہ تھی زندگی میری اجل نے آکے کھولی ہے
جگت اشیر ہے تو ہر آتما کو پیت ہے تیری — صنم خانہ کی یارب کیسی پیاری پیاری بولی ہے
تغیر روز کا کچھ دید کے قابل نہ تھا نرگس — بتا پھر کس کے نظارے کو تو نے آنکھ کھولی ہے
تبسم چاک جیبِ گل ترنم نالۂ بلبل — یہ بے مہروں کی باتیں ہیں یہ بے دردوں کی بولی ہے
مہ و خورشید و انجم ڈرتے ہیں ساتھ ساتھ اس کے — فلک کیا ہے کسی معشوق بے پروا کی ڈولی ہے
دیارِ عشق میں واماندگی رفتار ہے اے دل — جسے کہتے ہیں خاموشی وہ اس بستی کی بولی ہے

گماں تجھ پر ہوا تھا کیا دلِ بلبل کی چوری کا   صبا نے غنچۂ گل کیوں گرہ تیری ٹٹولی ہے

گلِ مضموں سے اے اقبال یہ بھرا ہے ناشر
غزل میری نہیں ہے یہ کسی گلچیں کی جھولی ہے

(۴) سونڈا ہیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر ۱   چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوت کی صدف میں پنہاں   مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر
سامنے ایسے گلستاں کے کبھی گر نکلے ۲   جیبِ خجلت سے سرِ طور نہ باہر نکلے
ہے جو ہر لحظہ تجلی گہِ مولائے جلیل   عرش و کشمیر کے اعداد برابر نکلے

اوائل عمر کے اس کلام میں بھی اقبال کی بلند پروازی صاف نظر آتی ہے اس کو مجموعہ کی آخری نظموں کے ساتھ دیکھیے تو آپ کو علم ہو گا کہ شاعر کی ابتدا کیا تھی اور انتہا کیا ہے۔

غرض یہ کہ جس بیاض میں یہ سارا مواد موجود تھا اس کے کھو جانے اور کسی چھپے ہوئے مجموعہ کے نہ ملنے کے باعث میں نظمیں دوبارہ جمع کرنے لگا مگر اس مرتبہ بہت سا کلام جو مجھے ازبر تھا اپنے حافظہ سے لکھا۔ تھوڑی مدت میں پھر تقریباً ڈیڑھ سو نظمیں فراہم ہو گئیں۔

مداحانِ اقبال کی بڑی تمنا تھی کہ یہی نظمیں ایک مجموعہ کی شکل میں چھپ جائیں۔

مولانا عمادی، مولوی نصیر احمد، ایم اے پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی، اور بہت سے دوستوں کی خواہش و اصرار، میرے قیام والٹیر کے "تاثرات"، اور چند ایسے اسباب، جن کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے خصوصیت کے ساتھ اس مجموعہ کی طباعت کے محرک تھے چنانچہ اس کے لئے میں نے مقدمہ لکھنے کا قصد کر تو لیا مگر اس خیال سے ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اقبال پر اُسی شخص کو قلم اُٹھانا چاہیئے جو اُن کی مانند بڑا شاعر اور مشرق و مغرب کے قدیم و جدید فلسفہ سے یکساں واقفیت رکھتا ہو اُن پر کچھ لکھنا ہر کسی کا کام نہیں ہے اسے میری ہیچمدانی کی غیر معمولی جسارت سمجھئے کہ ایک معمولی دیباچہ مرتب ہو گیا[1] اور الحمد للہ "کلیات اقبال" بھی زیور طبع سے آراستہ ہو چکا۔ اس سے پہلے اُنکا بھی کوئی اور مجموعہ نہیں نکلا لوگ متعجب تھے کہ آخر اقبال کا کلام یک جا کیوں نہیں چھپتا غالبًا اس کا سبب اقبال کی وہ نے حد حیا ہے جس نے اُن کو اپنی نظموں کی اشاعت کی اجازت دینے سے باز رکھا" یہ کلیات اُن کے اُس مجموعہ کا پیش خیمہ ہوگا جو ایک نہ ایک روز خود اُن کے اہتمام سے چھپے گا۔

(۲) اس کتاب کے حسب ذیل چھ حصے ہیں:-

اوّل: دیباچہ۔ جو اِن ابواب پر منقسم ہے۔

---

[1] مواد جمع ہوگیا تھا میں نے اس کی تدوین کردی ۲؎ حصہ نثر صفحہ ۴۔

ا۔ اقبالؒ کے مختصر حالات

ب۔ اقبالؒ کی شاعری

ج۔ اقبال کی تصنیفات

دوم: مۓ دو آتشہ۔ یعنی غزلیات جن میں مشرقی اور مغربی شاعری کا امتزاج نہایت نفیس ہے

سوم: نکات۔ یعنی ظرافت آمیز لیکن خرد آموز اشعار۔

چہارم: نقش قدرت۔ یعنی مناظر قدرت کی جیتی جاگتی تصویریں۔

پنجم: فانوس حیات۔ پانچویں اور چھٹے حصوں کی نظمیں حقایق و معارف کا گنجینہ

ششم: شمع طور۔ ہیں۔ ہر حصے کی ابتدا میں وہ نظمیں ہیں جو عام جذبات پر مبنی ہیں

اور آخر میں وہ جن میں اقبال اسلامی لباس میں جلوہ گر ہے۔

اس کتاب میں اقبال کے کم و بیش (۳۰۰۰) ہزار شعر ہیں۔

(۳) بعض نظمیں نالۂ فراق، التجائے مسافر، ایثار صدیق، ہمدردی وغیرہ ضرورت کے لحاظ سے دیباچہ میں درج ہو گئیں وہ مکرر مجموعۂ نظم میں نہیں داخل کی گئیں لیکن فاطمہ اور شجر ملت جیسی نظمیں جو دیباچہ میں نامکمل تھیں مجموعے میں مکمل کر کے شریک

؎ ان کا کچھ حصہ کشمیری میگزین سے ماخوذ ہے کہ اس موضوع کے تحت تنقید پیش کی جاتی لیکن دیباچہ میں اضافے کی گنجایش نہیں اس لئے تنقیدی مضمون علیحدہ شائع ہوگا جس میں اقبال کا موازنہ دنیا کے دوسرے شاعروں کے ساتھ کیا گیا ہے۔

کردی گئیں ۔

اس مجموعہ میں ایک آدھ غزل اور دو ایک نظمیں مثلاً دنیا اور مفلسی اقبال کے ابتدائی زمانہ کی ہیں، اگر یہ خارج کردی جائیں تو ایک دن وہ آتا کہ انھیں کی ایسی جستجو کی جاتی جیسی کہ حال میں مرزا غالب کے ابتدائی کلام کے لئے کی گئی ۔

(۴) پوری ایک ربع صدی سے اقبال اُردو زبان کی شاعری کو جو فائدہ پہنچا رہے ہیں اور اردو ادب میں جو بے بہا اضافہ کر رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے کلام کی کافی قدر کی جائے، رُباعیات عمر خیام کی مانند اس کے مختلف اڈیشن نکالے جائیں اور دیوان غالب کی طرح اس کی متعدد شرحیں لکھی جائیں ۔

دیکھئے! یورپ میں شکسپیر کے کلام پر حواشی کا کیا عالم ہے، کسی ڈرامہ کو لیجئے اس کے لکھے جانے کی تاریخوں اور تحریکوں کے علاوہ یہ تک بتا دیا جاتا ہے کہ (۱) خود شکسپیر نے اس کا فلاں مصرع پہلے اس طرح لکھا تھا بعد ازاں اس میں یہ ترمیم کی یا (۲) اس کے کلام کے مدونوں اور ناقدوں نے اس لفظ یا مصرع کی فلاں ترمیم قرین صحت تصور کی اور ان لفظی تغیرات سے مفہوم و معنی میں یہ وسعت و لطافت پیدا ہو گئی اور یورپ میں تحقیق کا یہ سلسلہ سولھویں صدی سے اب تک یوں ہی چلا جاتا ہے اس کے علاوہ بڑے بڑے مصنفوں کی غیر مطبوعہ دو سطریں بلکہ دو لفظ دو دو ہزار روپے میں فروخت ہوتے ہیں اور

ارباب ذوق اُن کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

اور سنئے مرزا شفیع یورپ کا باشندہ تھا، اس کی نظموں کا مجموعہ ایک سو چالیس بار چھپتا ہے، کاش ان باتوں میں ہم یورپ کی تقلید کرکے اپنوں کی علمی اور ادبی کاوشیں برباد نہ کریں اور ان کی حقیقی قدر و منزلت کرنا سیکھیں۔

(۵) ارباب تصنیف و تالیف ہی ان دشواریوں کا اندازہ کرسکتے ہیں جو جزئیات کے جمع کرنے، ان کو ترتیب دینے، پھر ان کی کمال صحت لکھائی چھپائی کے اہتمام کرنے میں بالعموم پیش آتی ہیں، خدا کے فضل سے یہ دشواریاں کچھ آسان ہوگئیں۔ برادر عزیز مولوی عبدالستار صاحب نے مواد فراہم کیا اور کتاب کی تدوین میں مدد دی اور ناظم الاخلاق مولانا سید غلام مصطفیٰ صاحب ذہین نے پروف دیکھے، یہ دونوں اصحاب میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔

(۶) اگرچہ اقبال کی طرح میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ "ہنر کوئی دکھتا ہے مجھ میں تو عیب میرے عیب جو کا" لیکن اس کا اظہار کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ کلیاتِ اقبال کی ترتیب و تدوین اور کتابت وطباعت کا جو معیار میرے پیش نظر تھا افسوس ہے کہ وہ میری طویل علالت کے باعث جو در اصل ۱۹۲۳ء کے آغاز سے جاری ہے درہم برہم ہوگیا۔

حیدرآباد دکن
۲ ستمبر ۱۹۲۴ء

محمد عبدالرزاق (علیگ)
مددگار صدر محاسب حکومت آصفیہ

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

دیباچہ

۱۔ اقبال کے مختصر حالات

نام اور وطن | شاعرِ عدیم المثال ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی بیرسٹرایٹ لا کا تعلق کشمیر جنت نظیر کے ایک معزز اور قدیم خاندان سے ہے وہ خود اپنے اصلی وطن کا ذکر کم سنی کے قطعات میں اس طرح کرتے ہیں۔

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

مقام و سنہ ولادت | تقویم عیسوی کا ایکہزار آٹھ سو چھیترواں سال تھا کہ مردم خیز خطہ پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں اقبال کی ولادت ہوئی والدین کو کیا خبر تھی کہ اس نومولود کی سحر بیانی کے چرچے ایک زمانہ میں ادبی محفلوں کو یوں مرعوب و مسحور کر دیں گے اور اسکے کلام بلاغت نظام کو دربار شاعری میں ایسی ممتاز جگہ ملجائیگی غرض اس گوہر شب چراغ کا ظہور ایک نازک زمانہ میں ہوا ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے فرو ہو چکے تھے اور ہندوستان کی محسود عالم سرزمین پر انگریزوں کے کامل تسلط کا اعلان بانگ دہل ہو چکا تھا۔ انگریزی تعلیم ملک کے طول و عرض میں شد و مد کے ساتھ شروع ہو رہی تھی ملک کے قدیم رسم و رواج دود چراغ محفل کی طرح پریشان ہو رہے تھے۔ محکوم مسلمانوں کو گوناگوں تحریص و ترغیب کے ساتھ اپنے آبائی شعار کے ترک کرنے کی تعلیم دی جا رہی تھی بچوں کو کلام مجید کی عرفان پاش آیات کی تعلیم اور کتب اخلاق کے مطالعہ کے عوض کوئین وکٹوریہ کی پرائمر اور کنگ البرٹ کی گرامر کے درس دئے جانے لگے تھے اللہ اللہ! انقلاب کی ستم ظریفی دیکھئے کہ خدا و رسول کے تعارف سے پہلے شاہ و وزیر کی ہیبت دلوں میں بٹھائی جا رہی تھی۔ بہر حال مغربی تہذیب چپے چپے جارحانہ اور فاتحانہ پیش قدمی کر رہی تھی۔

ابتدائی تعلیم | باایں ہمہ مُسلمانوں کے چند قدیم مکتب اور اُن کے مٹے مٹے نشان موجود تھے اسی قسم کے ایک مکتب میں اقبال کی تعلیم کی ابتدا ہوئی لیکن انگریزی تعلیم کے اُمڈے ہوئے اور نہ رُکنے والے سیلاب نے "مکتب" چھڑا کر ان کو اسکول میں داخل کرا دیا ان میں بچپن ہی سے خداداد ذکاوت و ذہانت کے آثار ہویدا تھے۔ ابتدائی جماعتوں سے لیکر مڈل اور مٹرک تک ہم درس طلبہ میں ہمیشہ ممتاز رہے جس کے صلہ میں سرکاری طور پر وہ ترغیبی وظائف حاصل کرتے رہے۔

اعلیٰ تعلیم | اعلیٰ تعلیم کا آغاز اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں ہوا جہاں مولانا سید میر حسن صاحب مشرقی ادبیات کے مُعلم تھے۔ ان کے فیض صحبت سے اقبال کو مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ایف۔ اے میں بدرجۂ اعلیٰ کامیاب ہونے کے بعد وہ لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج کی جماعت بی۔ اے میں داخل ہوئے بی۔ اے کا نصاب ختم کر کے امتحان دیا۔ انگریزی اور عربی کے مضامین میں شاندار کامیابی حاصل کی جس پر انہیں وظیفہ اور دو طلائی تمغے عطا ہوئے یہ وقت ایسا تھا کہ کسی مُسلمان کا صرف۔ بی۔ اے ہو جانا اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلانے کے لئے کافی تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن اُن کے علمی ذوق نے اس پر

اکتفا نہ کی۔ ایم۔ اے کی جماعت میں تعلیم پائی اور امتحان میں پنجاب بھر میں سب سے اول نکلے۔ پنجاب یونیورسٹی نے اس اعزاز میں ایک قیمتی تمغا دیا۔

اساتذہ | جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے سیالکوٹ کالج میں مشرقی ادبیات کے معلّم مولانا سید میر حسن صاحب تھے۔ اِن کی خاص توجہ و شفقت سے اقبال نے السنۂ مشرقیہ میں خاصی دستگاہ حاصل کر لی اور اسلامی ادبیات کا وسیع مطالعہ کیا

گورنمنٹ کالج لاہور میں آرنلڈ صاحب جو علی گڑھ کالج میں بزم اساتذہ کے ایک سرگرم رکن رہ چکے تھے فلسفہ کے مشہور پروفیسر تھے۔ اقبال نے غور و خوض کرنے والی طبیعت کے اقتضا سے بی۔ اے میں فلسفہ کا مضمون لیا تھا اور چونکہ غیر معمولی طور پر ذہین و فطین تھے اپنے ذوقِ نقاد و طبع وقاد کے سبب اُستاد کے دل میں جگہ پیدا کر لی آرنلڈ صاحب کو ایک نکتہ رس طالب علم مل گیا اقبال کو اس قدر عزیز رکھنے لگے کہ شاگردی و اُستادی کا امتیاز اُٹھ گیا اور تعلق دوستی اور مودت کی حد تک پہنچ گیا۔ اقبال کو بھی اپنے شفیق و مہربان اُستاد سے اِس درجہ محبت تھی کہ جب آرنلڈ صاحب لاہور کو خیرباد کہہ کے اپنے وطنِ مالوف واپس چلے گئے تو ایک سوز و گداز سے بھری ہوئی نظم بعنوان "نالۂ فراق" لکھی جس کی تمہید خود بیان کرتے ہیں۔

"اُستاذی قبلہ مسٹر آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد اُن کی جدائی نے"
"اقبال کے دل پر کچھ اس قسم کا اثر کیا کہ کئی دنوں تک سکونِ قلب کا مُنہ دیکھنا"
"نصیب نہ ہوا۔ ایک دن زورِ تخیل نے اُن کے مکان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا"
"اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان پر آ گئے جن کی اشاعت پر احباب مجبور کرتے ہیں"

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ مشرق کی پسند آئی نہ اُس کو سرزمیں
آ گیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقیں
ظلمتِ شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں

تا ز آغوشِ وداعش داغِ حیرت چیدہ است
ہمچو شمعِ کشتہ در چشمم نگہ خوابیدہ است

کشتۂ عزلت ہوں آبادی سے گھبراتا ہوں میں
شہر سے سودا کی شدّت میں نکل جاتا ہوں میں
یادِ ایّامِ سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں
بہرِ تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں

آنکھ گو مانوس ہے تیرے در و دیوار سے
اجنبیّت ہے مگر پیدا مری رفتار سے

ہو گئی رخصت مسرت غم مرا ہمدم ہوا
دفترِ صبر و شکیبائی جو تھا برہم ہوا
کچھ عجب اُس کی جدائی میں مرا عالم ہوا
دِل مرا منت پذیرِ نالۂ پیہم ہوا

حاضراں از دور چوں محشر خروشم دیدہ اند
دیدہ ہا باز است لیک از راہِ گوشم دیدہ اند

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونیکو تھا   آئنہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزؤں کا ہرا ہونیکو تھا   آہ کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونیکو تھا

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت
اندکے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم   تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم   تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرایشِ سودا کند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کند

دجلہ ریزی کر رہا ہے دیدۂ پُرخوں مرا   صورتِ سیماب مضطر ہے دلِ محزوں مرا
دردِ فرقت سے ہے رنگیں نالۂ موزوں مرا   داغِ حرماں ہے سراپا ہر گلِ مضموں مرا

آہ وہ حاصل نہیں اوروں کی مدحت میں مجھے
لطف جو ملتا تھا کچھ تیری ملامت میں مجھے

کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو   توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو
تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا

زندگی کا دامنِ انساں میں گویا خار ہے آرزو کا دل میں سینے میں نفس کا خار ہے
یوں تو اِس عالم کے ہر ذرے میں اُگتا خار ہے خارِ فرقت کا مگر سب سے نکیلا خار ہے
زندگانی در جگر خار است و پا در سوزن است
تا نفس باقیست در پیراہنِ ما سوزن است

شوقِ علم دیکھئے کہ اُستاد کے ولایت چلے جانے کے بعد شاگرد اکثر بیخودی کے عالم میں اُس کوٹھی کو دیکھ آتا تھا جہاں وہ مقیم تھے اقبال کے ذوقِ تحقیقات کو دیکھ کر آرنلڈ صاحب کہا کرتے تھے کہ ایسا شاگرد اُستاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔

مولانا میر حسن اور ڈاکٹر آرنلڈ دونوں اقبال کی خداداد طبیعت کے جوہر کو جلا دے رہے تھے۔ دونوں کی سعی و کوشش اور خواہش و تمنا تھی کہ شاگرد علوم مشرق و مغرب کا جامع ہو ایک کے عارفانہ خطبے اور دوسرے کے فلسفیانہ

نکتے شاگرد کی ہمہ رس طبیعت میں وہ عجیب وغریب امتزاج پیدا کر رہے تھے جو مرور ایام کے ساتھ اُن حیات افروز نظریوں اور دلنشین پیاموں کی شکل میں ظاہر ہونے والا تھا جن کے اقبال آج کل حامل ہیں۔

سکونت و فکر معاش

کالج کی اعلیٰ تعلیم سے بالکلیہ فارغ ہو کر اقبال نے پنجاب کے دار الملک لاہور میں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ فکر معاش کے لئے نکلے تو پہلے اورنٹیل کالج میں تاریخ وفلسفہ اور سیاسیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج میں جہاں طالب علمی کے بے فکر ایام گزارے تھے انگریزی اور فلسفہ کی اہم اور ذمہ دار معلمی پر مامور کئے گئے جس سے بزم اساتذہ کی رونق بڑھی۔ طلبہ کو اس جامعیت اور حُسن وخوبی سے درس دیتے تھے اور مختلف مسائل پر ایسی معنی خیز گفتگو کرتے تھے کہ بہت جلد شاگردوں اور اپنے ہمعصر اساتذہ اور دیگر ارباب کالج میں ہر دل عزیز ہو گئے۔ علمی مذاق ایسا پاکیزہ اور خیالات میں اتنی بلند پروازی تھی اور آئے دن کے واقعات وانقلابات پر رائے ایسی صائب اور متین رکھتے تھے کہ ہر وہ شخص جو اُن سے ملتا تھا اُن کی قابلیت کا اعتراف اور اُن کی مدح وثنا کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اُن پر اصحاب دانش وارباب بینش کی نظریں پڑنے لگیں اور اُن کا شمار لاہور کے مشاہیر میں ہونے لگا۔

تحقیقاتِ علمی | یونیورسٹیوں کی تعلیم میں جہاں ہزاروں مقاصد عیاں ہیں وہاں ایک بڑی اور اصلی غرض علمی تحقیقات کی پنہاں ہوتی ہے۔ مسائلِ مختصّہ کا گہرا مطالعہ اور اُن پر بہت زیادہ غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔ عجیب و غریب مشاہدات و تجربات سے کام لیا جاتا ہے۔ اس تجسّس و تفحص کے تاباں و درخشاں نتائج یہہ ہوا کرتے ہیں کہ نت نئی ایجادات و اختراعات اور نو بنو انکشافات سے دنیا باخبر ہوتی ہے اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور آرام و خوشحالی کے سامان نکل آتے ہیں ہندوستان میں جو گہوارۂ علم و حیات میں ابھی طفل شیر خوار کی طرح جھول رہا ہے اور جس کی ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے محررۂ ذیل نظم میں بالکل سچی تصویر کھینچی ہے یہہ مذاق مفقود ہے۔

فوق البشر نشستہ ہے اک ہستیِ عظیم | مصروفِ غور کف میں زنخداں لئے ہوئے
پہلو میں اُس کے اک زنِ گلگوں گداز تن | آبِ حیات سینۂ عُریاں لئے ہوئے

مشغولِ نوش چشمۂ آبِ بقا یہ ہے
طفل اک دہن میں غنچۂ پستاں لئے ہوئے

اہل ہند اندھی تقلید میں ایف۔اے۔ بی۔اے کامیاب تو ہو جاتے ہیں لیکن بدبختی سے یہہ محسوس نہیں کرتے کہ اصلی تعلیم بی۔اے کے بعد شروع ہوتی ہے

بی۔اے کی ڈگری کیا حاصل کی کتابوں کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دیا۔ وہ خود کو تعلیم یافتہ سمجھنے لگے۔ ان کورذوقوں نے تحصیلِ علم کو دو تین ڈگریوں پر منحصر رکھا ہے اور ذریعۂ معاش تصور کیا ہے حالانکہ علم ایسا بحرِ ذخار ہے کہ ساری عمر پیراکی اور غوطہ زنی کیجئے پھر بھی ساحل تک نہیں پہنچ ہوتی ہے اور نہ تہہ ملتی ہے۔

بہرکیف ہندوستان میں جہاں طلب و جستجو کا ذوق تقریباً معدوم سمجھنا چاہئے اقبال کی ہمہ گیر طبیعت میں اس کا شوق اس قدر وافر و غالب تھا کہ وہ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں رہتے تھے تشنگیٔ علم تقاضا کرنے لگی کہ یہ آتش سیر ہرگز نہ ہوگی یہ شدت کی پیاس اسی وقت بجھ سکتی ہے جب سعی و جستجو دو تگ و دو مغرب کے اُن چشمہ ہائے جاریہ تک کی جائے جہاں چند صدیوں پہلے اہلِ مشرق نااہل پاکر عالمِ حقیقی و قادرِ مطلق نے تمام علوم و فنون مشرق گوناگوں شکلوں میں منتقل کر دئے۔

سفرِ انگلستان بالآخر اقبال نے رختِ سفر باندھا اور اپنے حقیقی بھائی کی مدد سے قوی ہمت اور مضبوط ارادے کے ساتھ راہیٔ ولایت ہوئے۔ لندن جاتے وقت لاہور سے چند مخلص دوست "خانقاہِ عظمتِ اسلام" یعنی سرزمین دہلی تک اُن کے ہمرکاب تھے دہلی میں ان احباب کا وقت جس محویت و دلبستگی کے

ساتھ گزرا اس کا نقشہ نیرنگ کے قلم نے یوں کھینچا ہے۔

"۲ ستمبر ۱۹۰۵ء ہمارے خاص احباب کی تاریخ محبت میں ایک قابلِ یادگار دن ہے۔ صبح کا سہانا سماں ہے بمبئی میل دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی ہے۔ خواجہ سید حسن نظامی دہلوی اور منشی نذر محمد بی۔ اے اسٹیشن پر استقبال کو آئے ہیں استقبال کس کا ہے جدید شاعری کی روح رواں اقبالِ بااقبال اور اُس کے ہمراہیوں کا۔ وہ کیسے؟ اقبال بغرض تعلیم علوم و فنون انگلستان کو روانہ ہوئے ہیں۔ نیرنگ اور اکرام اپنے پیارے دوست کو رخصت کرنے کے لئے دہلی تک ساتھ گئے ہیں۔ ریل سے اُتر کر اول منشی نذر محمد صاحب کے مکان پر تھوڑی دیر آرام کیا۔ بعد میں سب دوست مل کر حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کی درگاہ آسماں پائگاہ کی طرف روانہ ہوئے راستے میں شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے کی زیارت اور سیر کی۔ درگاہ میں پہنچکر مزار مبارک پر حاضر ہوئے اول اقبال نے عالم تنہائی میں مزار مبارک کے سرہانے بیٹھکر ذیل کی نظم پڑھی اور اُن کی درخواست پر سب احباب باہر صحن میں ٹھہرے رہے بعد میں دوستوں کے اصرار پر اقبال نے اس نظم کو درگاہ کے صحن میں بیٹھ کر مزار مبارک کی طرف منہ کر کے دوبارہ ایک نہایت دردانگیز اور دلنشین لہجہ میں پڑھا سب

احباب اور دیگر سامعین نہایت متاثر ہوئے اور بے تحاشا زبان سے موقع بموقع کلمات تحسین و آفرین نکلتے تھے ایک محویت کا عالم تھا کہ جس کی تصویر حاضرین کے تصور ہی کھینچ سکتے ہیں۔ درگاہ سے واپس ہو کر خواجہ حسن نظامی صاحب کے مکان پر قیام کیا۔ ولایت نامی ایک نوعمر قوال خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر تھا نو تعلیم تھا مگر خوش گلو اور باطبیعت۔ وہ کچھ گاتا رہا اور وقت نہایت مزے اور کیفیت سے گزرا۔ اس کے بعد شہر کو واپس ہوئے۔ واپسی کے وقت خاتم الشعرا مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تربت پر حاضر ہوئے عجیب کیفیت تھی۔ بندہ بزرگ مرزا صاحب کی تربت کے سرہانے لوح تربت پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ میرے وہیں اقبال عالم محویت میں بیٹھے تھے اور تربت کے گرداگرد تمام پارٹی حلقہ باندھے ہوئے تھی دو بجے دن کا وقت اور دن بھی ستمبر کا۔ دھوپ تیز اور ہوا بند گمس مگر اسی قبر کی زیارت کا اثر تھا کہ کسی کو گرمی کا خیال تک نہ تھا قوال زادے کو عجیب وقت کی سوجھی۔ بولا حضور! مرزا غالب کی ایک غزل یاد آئی اگر اجازت ہو تو سناؤں۔ سرود بستاں یاد دہانیدن۔ یہاں عذر کس کو تھا چنانچہ اس نے یہ غزل گائی۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی　　　دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

ذیل کے دو شعروں پر عجیب کیفیت رہی۔

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں　　بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں　　اُٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

غزل کے ختم ہونے پر جب ایک دو منٹ میں ذرا ہوش بجا ہوئے تو سب چلنے کو اُٹھے اقبال نے جوشِ محویت میں مرزا صاحب کے مزار کو بوسہ دیا اور سب شہر کو روانہ ہوئے

اچھا اقبال۔

بسفر رفتنت مبارک باد　　بسلامت روی و باز آئی

زندہ رہیں گے تو تیس سال بعد تیرے کلام کو تیری زبان سے پھر سنیں گے۔"

التجائے مسافر

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا　　بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا

ترے وجود سے روشن ہے راہِ منزلِ شوق　　دیارِ عشق کا مصحف کلام ہے تیرا

نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی　　بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

خروشِ میکدۂ شوق ہے ترے دم سے　　طلب ہو نقر کو جسکی وہ جام ہے تیرا

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم　　نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار تو ام

در گشادہ جبینم گل بہار توام

کیا ہے تیرا مقدر نے مدح خواں مجھ کو　　کہے ہزار مبارک مری زباں مجھ کو

بیاں کروں تپش عشق کو تو آتش دل　　ٹھہرائے دے پئے تمہید داستاں مجھ کو

مرے سفینے کو تو نے کنارہ بوس کیا　　اماں نہ دیتا تھا جب بحر بیکراں مجھ کو

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل　　ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو

چلی ہے لیکے وطن کے نگار خانے سے　　شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

نظر ہے ابر کرم پر درخت صحرا ہوں　　کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھ کو

فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں　　تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے　　کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو

رہوں میں خادم خلق خدا جیوں جب تک　　نہیں ہے آرزوئے عمر جاوداں مجھ کو

پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں　　کیا جنوں نے محبت کا رازداں مجھ کو

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی　　رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی　　بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں　　کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے

یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

زمانۂ لندن کی مسافرانہ التجا کیا تھی وہ کتنے بلند ارادے رکھتا تھا اس کے دل میں
کن اعلیٰ خیالات کا ہجوم تھا اور کیسے ولولہ انگیز جذبات موج زن تھے مندرجہ بالا
نظم سے جو ابتدائی زمانہ کی ہے بخوبی واضح و روشن ہے۔ القصّہ ان خیالات
ان جذبات ان ارادوں اور ان التجاؤں کو لئے ہوئے اقبال دہلی سے
چلے۔ بمبئی آئے، جہاز پر سوار ہوئے، سات سمندر پار کئے اور مع الخیر لندن پہنچے
سفر کے بعد کمر ابھی نہ کھلی تھی کہ پھر میدان علم کے تگ و دو کے لئے کمر باندھی اور

زمانۂ قیام یورپ

کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ڈاکٹر میکنا گارٹ سے
فلسفۂ مغرب پڑھنے لگے۔ فلسفہ دانی اور فلسفہ کے درس و تدریس میں ڈاکٹر موصوف
کی شہرت عالمگیر تھی۔ ایسے مسلم الثبوت اُستاد سے اقبال جیسے جستجوئے پیہم کرنے والے
تلمیذ کا انتساب و اکتساب بے اثر و بے ثمر کیوں کر رہ سکتا تھا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے
عظیم الشان کتب خانہ میں اقبال نے غیر معمولی مطالعہ شروع کیا وہاں کے نامور
اساتذہ کی گراں قدر صحبت سے اُن کے دل و دماغ میں اعلیٰ خیالات و جذبات
کی فراوانی ہوئی۔ کچھ دنوں کی مسلسل اور لگاتار مشقت سے انھوں نے فلسفۂ اخلاق
کی ڈگری حاصل کی۔ پھر جرمنی گئے اور مطالعۂ فنون و ادبیات المانیہ میں منہمک ہو گئے

امتحان میں بہت تھوڑے دن رہ گئے تھے ۔ یونیورسٹی کے پرنسپل سے اجازت داخلہ
مانگی تو اُس نے عذر کر دیا کہ "اس قدر قلیل وقفہ میں جرمن زبان بھی تو نہیں آ سکتی"
اقبال کو جرمنی پہنچے ہوئے ایک ہی مہینہ گزرا تھا اور اتنی ہی مدت جرمن زبان کے
مطالعہ کے لئے انہیں ملی تھی مگر اس زبان میں پرنسپل کے ساتھ انھوں نے اس
برجستگی سے گفتگو کی کہ وہ مبہوت سا ہو گیا اور فی الفور شریک کر لیا ۔ یہاں اقبال نے
فلسفۂ عجم کی تنقیح و تحقیق شروع کی چند ماہ کی محنت و کاوش کے بعد اس فلسفہ پر ایک
مبسوط مضمون قلمبند کیا اور دقیق فلسفیانہ نکات ایسی سادگی اور وضاحت کے ساتھ
بیان کئے کہ یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ۔ دقت نظر وسیع مطالعہ اور علمی
قابلیت کے اعتراف میں میونخ یونیورسٹی نے پی ۔ ایچ ۔ ڈی (ڈاکٹر آف فلاسفی)
کی ممتاز ڈگری عطا کی یہ دلچسپ مضمون METAPHYSICS OF PERSIA
کے عنوان سے بشکل کتاب لندن میں چھپا اور آرنلڈ صاحب کے نام معنون کیا گیا
لندن میں اقبال نے قانون کی طرف بھی توجہ کی اور بیرسٹری کے امتحان
میں بآسانی کامیاب ہوئے ۔ پھر مدرسہ پولٹیکل سائنس میں داخل ہوئے اور اسکی
فضا بے حد خوشگوار پائی ۔ یہاں نامی گرامی علما و حکما اور بڑے بڑے مدبران
و دانایانِ فرنگ کی صحبت اُٹھائی اور نقادانِ فن کی بحث سے بہرہ اندوز ہوئے

لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوتے ہیں۔

اس زمانہ میں آرنلڈ صاحب لندن یونیورسٹی کے پروفیسر تھے آپ نے اپنی شدید ضرورتوں کی وجہ سے تین ماہ کی رخصت لی تھی اقبال کا علم وفن ایسا نہ تھا کہ لندن یونیورسٹی اور اُس کے بااقتدار ماہران علم وفن کو اپنی جانب مائل نہ کرتا۔ آرنلڈ صاحب کا قائم مقام اقبال سے بہتر اور کون ہوسکتا تھا چنانچہ وہ عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے لندن یونیورسٹی میں ایک نوجوان ہندوستانی کا بطور پروفیسر مامور کیا جانا بجائے خود اس امر کی صریح و روشن دلیل ہے کہ اقبال کی علمیت وقابلیت کا سکہ علمائے انگلستان کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا۔ ہرچند اقبال بڑی گہری مصروفیتوں میں قیام یورپ کا زمانہ بسر کر رہے تھے وہ اپنے دین کی خدمت سے کبھی غافل نہ رہے۔ اسلام پر نہایت عالمانہ و فاضلانہ متعدد لکچر دئے مادہ پرست باشندگانِ یورپ اُن کی روحانیت میں ڈوبی ہوئی فلسفیانہ تقریروں کو سُن کر انگشت بدنداں اور تحقیقات و معلومات کو دیکھ ششدر و حیران رہ جاتے تھے۔

تہذیب مغرب اقبال کی نظر میں

اقبال کو لندن کے دوران قیام میں برِّاعظم یورپ کے مختلف ملکوں کی سیاحت کا زرین موقع ہاتھ آیا۔ اس سیر وسفر نے اُن پر تہذیب مغرب کے تکلف و تصنع اور عیب و نقص کا انکشاف کیا۔ بالکل سچ کہا ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی　　یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

مشرق و مغرب میں انھوں نے بڑا فرق پایا۔ انگلستان و المانیہ ہو یا فرانس و اطالیہ ہیں ہر قوم کے ضمیر و سرشت میں مادہ پرستی سرایت کر گئی ہے جس طرف نظر ڈالئے جس کو دیکھئے تین زے (ز) کی تحصیل کو مدعائے زندگی سمجھے ہوئے ہے۔ زر، زن، زمین۔ یہ ایسی عزیز و محبوب ترین اشیا ہیں کہ نظر ان پر سے ہٹائے نہیں ہٹتی اور جو یہ چیزیں مہیا ہو گئیں تو پھر دین اور دنیا کی کچھ خبر نہیں فکر مذہب ہے نہ ذکر اخلاق، پاس مروت ہے نہ بات اخلاص، روحانیت مفقود انسانیت معدوم غرض نظر و بصر کے لئے بیسیوں مسائل قابل تنقید و تفتیش سامنے آگئے اور مشرق نژاد شاعر اہل مغرب سے یوں مخاطب ہوا۔

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی　　جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا
دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

لطیفہ | لندن میں ایک ناکتخدا میم صاحبہ اقبال کے سامنے اکثر ملاقات کے وقت مذہب عیسوی کو ہر مرتبہ نئے پیرایہ اور مختلف انداز سے پیش کیا کرتی تھیں۔ اور یہ لولوئے فرنگ جب تبلیغ و تلقین میں بہت مصر ہوئیں تو اقبال نے جواب دیا کہ دین عیسوی نجات کے واسطے خواہ کافی ہو یا نہ ہو لیکن اس متاع زندگی کے لئے

جس کے متمنی یورپ کے جوان مرد و زن عموماً اور مس صاحبہ موصوفہ خصوصاً رہتی
ہیں کسی طرح رہنما اور قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا کیونکہ حضرت مسیحؑ جنہیں دوشیزہ سے شادی کا
مطلق تجربہ نہ تھا کسی طرح اس بارے میں رہنمائی نہیں کر سکتے" یہ پُرلطف جواب سن کر
بیان کیا جاتا ہے کہ میم صاحبہ مذہبِ عیسوی سے بد دل ہو گئیں۔

وطن کو مراجعت

اقبال نے اس طرح تقریباً ڈھائی سال سرزمین یورپ کی تعلیم گاہوں
میں بسر کئے اور علوم مشرق و مغرب کے مجمع البحرین بن کر بصد عافیت و سلامتی و بہزار
کامیابی و شادمانی ۱۹۰۸ء کے وسط میں اپنے وطن کو مراجعت کی۔ انگریزی
تعلیم نے ہندوستان کے نوجوانوں پر جو اثر ڈالا ہے اور اُن کے مذہبی عقائد
کے آبگینہ کو جو ٹھیس لگائی ہے اظہر من الشمس ہے یہ ممکن نہیں کہ مذہب کے
سادہ اُصول کی آگاہی اور شریف و نیک روایات خاندان کی سلامت روی
اولیاء اللہ کے حُسنِ عقیدت کو زائل کر سکے خواہ انگریزی تعلیم کسی حد تک حاصل کی جائے
مغرب کی ظلمت آگیں نئی روشنی، برق رفتار ذرائع حمل و نقل، سائنس اور فلسفہ کی
جھلکیاں زرق برق لباس، جگمگاتے ہوئے ہوٹل، سینما، قہوہ خانے
سیر گاہیں اور محفل ہائے رقص و سرود غرض کوئی چیز مذہب پر حملہ نہیں کر سکتی
اگر یقین و ایمان کا قلعہ مستحکم ہو۔ اقبال کے والدین راسخ العقیدہ تھے۔ اُن کو

بزرگانِ دین سے گہری عقیدت تھی۔ اقبال میں جو خوبیاں جمع ہوئیں وہ بڑی حد تک خاندانی اثر کے باعث ہوئیں جس کا ذکر لسان العصر اکبر اپنے قطعہ مندرجہ ذیل میں کرتے ہیں جو اقبال کی والدہ کی رحلت کے موقع پر انھوں نے کہا تھا ؎

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں — قوم کی نظریں جو اُن کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی یہ خوش گوئی یہ ذوقِ معرفت — یہ طریقِ دوستی یہ خودداری با تمکنت
اس کے شاہد ہیں کہ اُن کے والدین ابرار تھے — با خدا تھے اہلِ دل تھے صاحبِ اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انہیں کا ہے بفیضِ تربیت — ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت
مادرِ مرحومۂ اقبال جنت کو گئیں — چشمِ تر ہے آنسوؤں سے قلبِ اندوہگیں
روکنا مشکل ہے آہ و زاری و فریاد کو — نعمتِ عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو
اکبر اس غم میں شریکِ حضرتِ اقبال ہے — سالِ رحلت کا یہاں منظور فی الحال ہے

واقعی مخدومۂ ملت تھیں وہ نیکو صفات
رحلتِ مخدومہ سے پیدا ہے تاریخِ وفات

بزرگانِ دین سے عقیدت اقبال کے ورثہ میں چلی آئی چنانچہ وہ مذہب اور اعتقاد کے مرکز اور نگاہ کو خیرہ کرنے والے بلادِ یورپ میں اقامت گزین رہنے کے باوجود واپسی میں پھر دہلی آئے اور کمالِ ارادت کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہٗ

کے بے نیاز آستانۂ مبارک پر سرِ نیاز خم کیا۔ راہ اسلام میں اُن کے پائے ثبات کو ذرا لغزش نہ ہوئی۔ دینی عقائد میں ولایت سے محکم تر ہو کر واپس ہوئے۔ یورپ کے صنم کدے میں صراط مستقیم پر ثابت قدم رہنا آسان نہ تھا بریں ہم کعبہ کی پرستش کی اور دوسروں کو پرستش کی ترغیب دی۔ دہلی میں پھر اخلاص کیش و وفا شعار احباب اُن کے استقبال کو آئے بزم سخن سونی پڑی ہوئی تھی اور اُس کو گرمانے کے لئے سب دوست بے تابانہ منتظر تھے۔ نیرنگ نے حسب ذیل خیر مقدم کیا اور ایک نظم پڑھی

"اقبال کا ولایت سے بخیریت واپس آنا اہل دل اور اہل سخن کے لئے کوئی معمولی خوشی کی بات نہیں ہے۔ یہی ایک شخص ہے جس کے دم سے اردو زبان کی اعلیٰ اصلی اور سچی شاعری کی تمام امیدیں آج وابستہ ہیں۔ ان کے تشریف لانے سے اہل علم اور ارباب ذوق اور اصحاب سخن میں ایک خاص مسرت پھیلی ہوئی ہے۔ راقم عرصہ دراز سے دنیا کے دھندوں میں اس قدر گرفتار ہے کہ شغل سخن سے قطعی محروم ہے مگر اقبال کی آمد کی خوشی میں انبالہ سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں مندرجہ ذیل چند سطر یں لکھوا ہی لیں۔ یہ چند سطریں ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء کو درگاہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہٗ مقام دہلی میں ایک ایسی بزم میں پڑھی گئیں جس میں اقبال کی شمع کمال کے چند پروانے جمع تھے اور جہاں دن بھر اقبال کی آمد کی خوشی

ہدیۂ مہمان نوازی خواجہ سید حسن نظامی صاحب دام فیضہ بہ جناب ممدوح۔

فصلِ بہار آئی پھر گلشنِ سخن میں — اک جشن ہو رہا ہے مرغانِ نغمہ زن میں
وہ مژدۂ مسرت لائی صبا چمن میں — پھولے نہیں سماتے پھول اپنے پیرہن میں
ہاں ہوئی ادا سے سنبل کی کنگھی چوٹی — نرگس لگائے سرمہ چشمانِ سحر فن میں
غنچوں کو حکم دیدو دیں داد کج کلاہی — تیکھی ادائیں نکلیں شیریں و نسترن میں
ہر غنچہ مسکرائے ہر پھول کھل کھلائے — ہر برگ لہلہائے رونق بڑھے چمن میں
ہو اہتمام ایسا آرائش چمن کا — باقی رہے دقیقہ کوئی نہ بانکپن میں
یورپ کی سیر کرکے اقبال واپس آئے — خوشیاں منائیں مل کر ارباب ذوق و فن میں
ہے آمد مسرت اقبال تیری آمد — خوشیاں ہیں اہلِ دل میں عیدیں ہیں اہلِ فن میں
سر آنکھوں پر بٹھایا یورپ میں تجھ کو سب نے — غربت میں بھی رہا تو گویا سدا وطن میں

پھر تیرے دم سے ہوں گے تازہ سخن کے چرچے
پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

لاہور پہنچتے ہیں

اس کے بعد اقبال بعزم لاہور روانہ ہوئے جہاں تمام صاحبانِ مذہب و ملت احباب اُن کو لینے کے لیے آنکھیں بچھا رہے تھے نہایت تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ اُن کا استقبال ہوا۔ سارے شہر میں اُن کی آمد کی خبر برق کی طرح

دوڑ گئی جوش و خروش نے اندازہ تھا۔ بڑی دھوم مچی۔ جلسے ہوئے خیر مقدم کی محفلیں منعقد ہوئیں۔ دعوتیں دی گئیں۔ یارانِ نکتہ دان سرگرم نائے و نوش ہوئے اکثر دوستوں نے استقبالیہ نظمیں پڑھیں اور جو موجود نہ تھے انھوں نے نظمیں لکھ لکھ کر بھیجیں جن میں سے ایک یہاں درج کی جاتی ہے۔

آگئے ہو کر علم کی دولت سے مالا مال تم ۔۔۔ بن گئے اقبال سے اب ڈاکٹر اقبال تم
ہو کے کامل فلسفہ کے علم میں آئے ہو تم ۔۔۔ خوبیاں حکمت کی کیا کیا دل میں بھر لائے ہو تم
ہند میں چھائی گھٹا ادبار اور نکبت کی ہے ۔۔۔ اب ضرورت اس کو ایسے شخص کی خدمت کی ہے
صرف اک پنجاب ہی تم پہ نہیں نازش کناں ۔۔۔ بلکہ ہو تم مایۂ صد فخرِ کل ہندوستاں
آپ کی نظموں کے اک مدت سے ہم مشتاق تھے ۔۔۔ آپ فنِ شاعری میں شہرۂ آفاق ہیں

اقبال کی ولایت سے مع الخیر واپسی پر اہلِ وطن نے جو خوشیاں منائیں بے جا و بے وجہ نہ تھیں۔ اس وقت اُن کی عمر ۳۱۔ ۳۲ سال سے زیادہ نہ تھی اس سن میں شاذ و نادر افراد ہی کی قسمت میں یہ بات ہوتی ہے کہ ان کی مانند اتنے اعلیٰ اسناد اور تمغے اور ایسی غیر معمولی عزت و قابلیت حاصل کریں۔ یہ اکتساب غیر معمولی دل و دماغ کا حصہ ہوتا ہے۔ ہر شخص کا کام نہیں ایسی نادر الوجود اور باکمال ہستیاں مادرِ گیتی کے بطن سے روز روز نہیں پیدا ہوتیں۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سچ یہ ہے کہ ایسے ادبار و مصائب سے بھرے ہوئے زمانہ میں کس کو یہ توقع تھی کہ اقبال انگریزی تعلیم کے اثر سے مشرقی علوم کی تحصیل کو خیر باد نہ کہہ دینگے الحمد للہ انگریزی تعلیم مشرقی ادبیات کی تحصیل میں مانع و مزاحم نہ ہوئی وہ اُردو، فارسی، عربی اور یورپ کی کئی زبانوں میں ماہر ہونے کے علاوہ سنسکرت سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ مغربی اور اسلامی فلسفہ کے ساتھ ساتھ قدیم ہندو فلسفہ کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی سب قوموں میں یکساں ہر دل عزیز ہیں۔ ملک کی اکثر انجمنوں نے ان سے وابستگی پیدا کی ہے۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور اور انجمن مسلمانان کشمیر خاص طور پر ان کی قابلیت سے فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔ اسلام کی اعلیٰ اور خاموش خدمتیں جو سن شعور سے آج تک انھوں نے خصوصیت کے ساتھ انجام دی ہیں تعریف و توصیف سے برتر و بالا ہیں

ترک ملازمت بیرسٹروں کے زمرہ میں اقبال اُسی وقت داخل ہو چکے تھے جب وہ کیمبرج میں تھے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد انھوں نے ملازمت قطعًا ترک کر دی اور لاہور میں وکالت شروع کی۔ اگرچہ قانون کا پیشہ اُن کے فطری مذاق کے موافق نہ تھا لیکن کسب معاش کی خاطر اُن کو اس میں اپنا عزیز وقت

صرف کرنا پڑا۔ اُن کی گراں مایہ حیات کا یہ دور اُن لوگوں کو بہت ہی عزیز ہے
جو ہندوستان کی زندگی پر اُن کے اثر کو قانونی کارناموں کی بہ نسبت زیادہ
پُرعظمت اور مفید سمجھتے ہیں۔ اپنے پیشہ کے اوقاتِ فرصت میں اقبال نے
ایسی زلزلہ خیز اور دل ہلا دینے والی نظمیں لکھیں جنہوں نے صدیوں کے خوابیدہ
افراد کو گھڑیوں میں بیدار کردیا اور اُن میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ یہاں تک
کہ وہ خود ایک نئے دور کے نقیب اور بانی ہوگئے۔ عہد عتیق کی تاریخ اور نیز ہمارے
زمانہ کے واقعات شاہد ہیں کہ انسانوں کا قتل ایک بہت آسان سی بات ہے
لیکن اُن کے خیالات کی کایا پلٹ دینا بے حد دشوار۔ صرف عظیم الاخلاق
ہستی ہی زمانہ کے انحطاط و زوال کے بُرے اثرات کی روک تھام کرسکتی ہے
ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کے کشتِ دماغ کی سرسبزی و زرخیزی اور ان کی سحر نگاری و
آتش بیانی نے اُن کو اس قابل کردیا کہ وہ کاہلی و غفلت کے دبیز کُھر کو منتشر کرسکیں
اور قومی قلب کے اندر تک پہنچکر اُس کے برف کدہ کو گرما اور پگھلا دیں۔

نوبل پرائز | چند سال پہلے روڈیارڈ کپلنگ اور رابندرناتھ ٹیگور نے نوبل پرائز
حاصل کیا تھا یہ (۸۰۰۰) پونڈ (ایک لاکھ بیس ہزار روپے) کا ایک انعام ہے
جو سویڈن کے مشہور توانگر انجینئر ڈائنامیٹ کے مخترع اور ماہر فن کیمیا ڈاکٹر الفریڈ نوبل

کی وصیت کے موافق ہر سال بین الاقوامی مجلس علما کے فیصلہ کی رو سے شاہ سویڈن کے ہاتھوں اس شخص کو دیا جاتا ہے جو دنیا کا -

(۱) عظیم ترین موجد و مخترع ہونے کی قابلیت رکھتا ہو یا

(۲) طبعیات، کیمیا یا طب میں سب سے بڑا ماہر فن تسلیم کیا جائے یا

(۳) حامی جنگ و جدل نہ ہو بلکہ ساعی صلح و امن ہو یا

(۴) بہترین مصنف کسی خاص نوعیت کی ممتاز ترین ادبی یا علمی تصنیف کا ثابت ہو۔

آج کل اقبال کی شاعری کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا ہے۔ اُن کے ایک ایک مصرع پر اہل ذوق کا دل پہلو سے نکل جاتا ہے۔ ان کی نظمیں عجیب و غریب لذت، سرور اور وجد پیدا کرتی ہیں۔ اپنی فلسفیانہ رنگ کی شاعری کے لحاظ سے مذکورۂ بالا "نوبل پرائز" کے وہ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اور اُمید بندھ گئی تھی کہ ۱۹۲۳ء کا انعام انہیں کو ملے گا لیکن یہ آئرلینڈ کے شاعر مسٹر اٹیس کے حصہ میں آیا جس کی خبر شائع کرتے ہوئے متعدد اخباروں نے اقبال کے استحقاق کا ذکر کیا ہم اس کی نسبت صرف اخبار ٹائمز آف انڈیا اور بمبئی کرانیکل سے دو اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا لکھتا ہے کہ "یہ اعلان کہ

اس سال علم ادب کا نوبل پرائز مسٹر ایٹس کو دیا گیا ہے ہندوستان میں کسی قدر مایوسی کا باعث ہوگا کیونکہ یہ افواہیں گرم تھیں کہ وہ اس مرتبہ کسی ہندوستانی کو دیا جائیگا جیسا کہ چند سال پہلے ٹیگور کو ملا تھا۔ تین چار مجوزہ ناموں میں سب سے زیادہ قابل وقعت نام ہندوستان اور یورپ کے علمی حلقوں میں سر محمد اقبال کا ہے اگر ہندوستان کی ایک دفعہ اور قدر و منزلت کی جاتی تو اقبال سے بہتر کوئی اور اس کا مستحق نہ ہوتا۔"

بمبئی کرانیکل میں ہے کہ "شاعری کے خداداد وصف کی بدولت جو اثر مسٹر ایٹس نے اپنے ساتھیوں میں پیدا کیا۔ اس کی ہمسری اگر کوئی دوسرا کر سکتا ہے تو وہ ہندوستان کا اعلیٰ ترین شاعر اقبال ہے۔ فی الحقیقت ان دونوں کی شاعری بلحاظ تصوف و روحانیت کئی باتوں میں ملتی جاتی ہے دونوں فطرت نگار ہیں حسن کی شگفتگی اور قدرت کی گل کاری کا جذبہ دونوں میں موجود ہے دونوں سرگرم حامیان وطن و بنی نوع انسان ہیں۔ ملک میں ایک وقت یہ اُمیدیں بندھ گئی تھیں کہ اس سال انعام اقبال کے حصہ میں آئے گا۔ ان توقعات کے پورا ہونے کا امکان بھی ریوٹر کی ایک اطلاع سے فی الواقع پایا گیا تھا لیکن اب انعام دوسرے کو مل چکا ہے۔"

منکسرالمزاجی

باوجود ایسے یگانۂ روزگار ہونے کے اقبال نے مولانا عبداللہ عمادی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ اکبر نے تو یہ لکھا تھا کہ -

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

لیکن یہاں لاہور میں نہ تو اکبر ہیں نہ امرود ایک اقبال ہے وہ بھی برائے نام

اس خط کا مولانا عمادی نے کیا خوب جواب دیا کہ

تجھ پر اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں — اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالا مال ہے
ہم نے مانا تو نہیں مسحور تہذیب فرنگ — تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے

بدیہہ گوئی

نواب سر ذوالفقار علیخاں بہادر جب مہاراجہ پٹیالہ کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تو اقبال نے برجستہ کہا -

ہند و بہ ذوالفقار علی ناز می کند

ب۔ اقبال کی شاعری

اقبال کو اوائل عمر ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس شوق میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی۔ ان کی ذکی الحس اور سریع الفہم طبیعت میں مذاق سخن نہایت شستہ اور خداداد ہے۔ طالب علمی کے ابتدائی زمانہ میں ان کی شاعری کا حال مدرسہ کے طلبہ اور احباب کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ خود بھی اپنے جوہر قابل سے بے خبر تھے جیسا کہ ایک جگہ کہتے ہیں ع اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد انھوں نے ادبیات کا وسیع مطالعہ کیا اور ان کی معلومات میں آئے دن اضافہ ہوتا گیا۔ تھوڑی سی مشق سے جب اچھے اچھے شعر نکلنے لگے تو ارباب مذاق کو اُن کی ذہانت و ذکاوت کا علم ہونے لگا۔ طبیعت فلسفیانہ اور مشکل پسند ہونے کے باعث مرزا غالب کی ابتدائی مشقوں کی طرح اِن کی سخن آزمائی بھی اول اول خطرہ سے خالی نہ تھی اِس لئے زمین شعر پر ان کو ایک خضر راہ کی ضرورت لاحق ہوئی جیسا کہ اُس زمانہ کے ہر شاعر کو ہوا کرتی تھی آگے چل کر ظاہر ہوگا کہ اگرچہ انہیں ارشد و داغ

سے تلمذ رہا ہے لیکن حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ وہ فطری شاعر اور اپنے آپ استاد ہیں ع شوق در رہ دل کہ باشد رہبرے درکار نیست ۔

طرز بیان | اپنے اُستاد مرزا داغ کی سلاست و سادگی زبان اختیار کرنے کے بجائے ان کا فارسیت پسند اور مشکل گو ہونا بادی النظر میں یہ گمان پیدا کرتا ہے کہ وہ طرز بیان میں مرزا نوشہ کے پیرو ہیں لیکن بہ نظر غائر دیکھئے تو صاف طور پر معلوم ہوگا کہ وہ قطعی کسی کی تقلید نہیں کرتے اپنا خاص اور ایسا دلآویز طرز رکھتے ہیں جو موجودہ زمانہ کے بڑے بڑے شاعروں کے رنگ پر غالب آ جاتا ہے

زطرز دلکش اقبال می تواں دریافت

کہ درس فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

لسان العصر اکبر مرحوم نے اُن کے اس طرز کی مقبولیت کو محسوس کر کے کہا تھا ع قوم کی نظریں جوان کے طرز کی شیدا ہوئیں ۔ قطع نظر اس کے کہ ملک میں اقبال کا یہ رنگ مقبول و مطبوع خلائق ہوا اس کی عجیب خصوصیت یہ رہی کہ کسی شاعر سے اس کی کامیاب تقلید نہ ہو سکی ۔ اس بارے میں سالک کا یہ قول صحیح ہے کہ "علامہ اقبال نے اپنی حیات اور شاعری سے شعر کی دنیا میں جو انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ۔ لیکن ان کی غلط

تقلید نے بہت سے نوجوان شاعروں کی کاوشیں برباد اور عمریں تباہ کی ہیں۔ ان کے نزدیک اقبال کی تقلید صرف اسی میں ہے کہ چند فارسی کی ترکیبیں جمع کرکے ایک نظم تیار کر دی جائے اس میں معنی نہ ہوں اس میں شاعرانہ بلند خیالی اور فطرت کی صحیح مصوری نہ ہو اس کی پرواہ نہیں لیکن "شعر گفتن ضرور است" حقیقت میں یہ دنیا کے بہت بڑے شاعر کی علامت ہوتی ہے کہ وہ اپنی راہ آپ نکال لے۔ کسی کی تقلید سے اس کا رنگ سخن بری ہو اور خود اس کے رنگ کی پیروی کسی سے کما حقہٗ نہ ہو سکے۔

تلمذ | انیسویں صدی کے اخیر سے پہلے دہلی کی تیموری شمع گل ہو چکی تھی۔ صاحب عالم مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی دودمان مغلیہ کی چند یادگاروں میں سے ایک صاحب علم و فضل ہنوز باقی تھے۔ لیکن دود چراغ کشتہ یعنی اپنے خانوادہ کی طرح اجنبی فضا میں پریشان تھے۔ انھوں نے کسب معاش کی خاطر لاہور کو اپنا مسکن بنا لیا تھا وہ تصنیف و تالیف برجستہ اور شعر و سخن کا فکر بے ساختہ کیا کرتے تھے ان کا شمار اساتذۂ فن اور مشاہیر وقت میں تھا بہ لحاظ قربت اقبال نے پہلے انہیں سے مشورۂ سخن کیا۔ اصلاح کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا تو پھر اُستاد وقت نواب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی جو اس زمانہ میں حیدرآباد میں مقیم تھے اور

جنہیں ہندوستان کی دنیا ایشیائی شعرا کے خاتم کی حیثیت سے جانتی تھی اپنا کلام بھیجتے رہے چنانچہ فخر تلمذ میں ایک مقطع کہا ہے۔

نسیم تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردئ داغ سخنداں کا

مرزا ارشد کے دل پر بھی اقبال کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی اور ان کی غیر معمولی طباعی اور بلند پروازی کے نقش مرتسم تھے۔ پچیس سال ادھر لاہور میں ایک مشاعرہ نہایت اہتمام کے ساتھ منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس میں نامی گرامی سخنور اور سخن فہم شریک ہوتے تھے۔ لوگ بیشتر ظاہر پرست ہوتے ہیں اور سطحی نظر رکھا کرتے ہیں ایسے بڑے مشاعرہ میں کون کہہ سکتا تھا کہ نوخیز اقبال کو کامیابی ہوگی۔ لیکن ع سالے کہ نکوست از بہارش پیداست جب بزم سخن گرم ہوئی اور اس ہونہار نے پہلی دفعہ طرح پر اپنی ایک غزل دل کش لب ولہجہ کے ساتھ شیریں و مؤثر انداز میں پڑھی تو حاضرین مشاعرہ کو اپنی گرم گفتاری کی جانب متوجہ کر لیا اور جب اس غزل کا یہ شعر

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

سُنایا تو ہر طرف سے تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہوئے۔ مرزا ارشد بھی موجود تھے
بے اختیار داد دی اور مسرت اندوز استعجاب سے کہہ اُٹھے "ہائیں اقبال!
اس عمر میں اور یہ شعر" اس کے ساتھ ہی سُبحان اللہ اور واہ وا کی صداؤں سے
مشاعرہ کی فضا گونجنے لگی۔ جتنے سخن سنج اس مجلس میں جمع تھے سب کے
سب اقبال کی طبع سلیم اور جوہر قابل کے معترف ہوئے۔ ملک کے طول
و عرض میں یہ شعر زبان زد خاص و عام ہوگیا۔ سخن سنجوں کو آسمانِ شاعری کا
ایک نہایت روشن ستارہ نظر آیا۔ اس کے بعد جہاں کہیں یہ اطلاع دی جاتی کہ
"اقبال اپنی نظم پڑھیں گے" تو لوگ وہاں کثرت سے جمع ہو جاتے تھے اور
اُن کے قلوب میں اقبال کے اشعار ایسا اشتیاق پیدا کرتے تھے کہ حیطۂ
بیان میں نہیں آسکتا جب کبھی مجمع کثیر کے سامنے یہ نوجوان شاعر اپنا کلام سناتا تھا
تو مدح و ستایش کی لہر مثالِ برق اس سرے سے اُس سرے تک دوڑ جاتی تھی
یہ بات اتفاقات ہی سے ہوتی ہے کہ ایک نوجوان کو جو ابھی طفلِ دبستان ہی
ہے پیشوائی کا منصب مل جائے اور لوگ اُسے قابلِ پرستش سمجھیں۔ اقبال
کی مانند دنیا کے کسی اور شاعر نے دفعتہً اس قدر مقبولیت اور ہر دلعزیزی
حاصل نہیں کی۔ ایک پنجاب ہی پر موقوف نہیں سارے ہندوستان میں

انھوں نے ایسا اثر پیدا کر دیا کہ کسی کو مسابقت کا موقع نہیں مل سکا۔ اقبال کا ترنم شروع ہوتا تو جلسہ میں ایک سماں بندھ جاتا تھا وہاں کسی دوسرے شاعر کے لئے اپنا رنگ جمانا ممکن نہ تھا۔

راہِ عمل | ایشیا میں شاعری کا آغاز عموماً غزل گوئی سے ہوتا رہا ہے۔ دوسرے شاعروں کی طرح اقبال نے میدانِ تغزل میں طبع آزمائی شروع کی تھی کہ اتنے میں زورِ طبیعت نے بزور کہا۔

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے

روز بروز یہ احساس ہمارے سنجیدہ شاعر کے دل میں چٹکیاں لینے لگا کہ زمانہ کا رخ بدل گیا ہے، حکومت ہاتھ سے جا چکی ہے اور ملت کی حالت خوار و زبوں ہے
ع ملک ہاتوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں ؛ وہ گلہائے تقطّف و دبدبہ اور ناز و نیاز اور وہ پہلی سی شوکت و سطوت اور محبت و مروت کہاں کہ تغزل سے تفریح طبع کیجئے۔ شاعری اقبال کا ایک زبردست آلہ اور عروج کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ یہ وہ صنعت ہے جو اپنے ملک کو ترقی و خوشحالی اور سکون و اطمینان کی جانب لے جا سکتی ہے اس سے ایسا کام لینا چاہئے جو شائستہ قوم

کی از سر نو تعمیر میں مدد دے اور ملک کے واسطے مفید اور سود مند ہو -

موضوع شاعری

اس خوشگوار احساس کا نتیجہ نہایت مبارک نکلا۔ اقبال نے شاعری کا اصل موضوع وہ اختیار کیا جس کی جانب آج سے تیرہ سو سال پہلے رسول کریم (روحی فداہ) کے ذوقِ حقیقی نے رہنمائی کی تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہی امر کلامِ اقبال کے اعجاز کا باعث اور اس کے غیر معمولی اثر کا ضامن ہوا جی نہیں چاہتا کہ ہم اس حقیقی موضوعِ شاعری کا تذکرہ کئے بغیر آگے بڑھیں اس لئے خود اقبال کا ایک بے بہا مضمون جس کا عنوان "جناب رسالت مآب کا ایک ادبی تبصرہ" ہے یہاں درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ شاعری کا مقصد در اصل کیا ہونا چاہئے -

"حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا اُن کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لئے خطِ پاشاں کا حکم رکھتی ہے لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپ نے ارشاد فرمائیں اُن سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانہ میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے اس لئے کہ ان کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے اور آج انہیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے شاعری کیسی نہ ہونی چاہئے

اور کیسی ہونی چاہئے یہ وہ عقدہ ہے جسے جناب رسالت مآب صلعم کے وجدان نے اس طرح حل کیا ہے۔

امرء القیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جناب پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسب ذیل رائے ظاہر فرمائی ہے اَشْعَرُ الشُّعَرَاءِ وَقَائِدُهُمْ اِلَی النَّار یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں اُن سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امرء القیس کی شاعری میں وہ کونسی باتیں ہیں جنہوں نے حضور سرور کائنات سے یہ رائے ظاہر کرائی۔ امرء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شراب ارغوانی کے دور، عشق و حسن کی ہوش رُبا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پُرانی بستیوں کے کھنڈروں کے مرثیوں، سنسان رتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اور یہی عرب کے دور جاہلیت کی کل تخیلی کائنات ہے۔ امرء القیس قوت ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بیخودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ لطیفہ کے اس اہم اُصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع وبدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی اچھا شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیّین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھا دے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اُس شاعر پہ حیف ہے جو قومی زندگی کے مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طور پر اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اُس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصّہ اُسے دکھایا گیا ہے اُس میں اوروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اُٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے اُس کو بھی ہتھیا لے۔

ایک دفعہ قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنایا گیا۔

ولقد ابیت علی الطوی وَاظلّه

حتی انال بہٖ کریم الماکل

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ میں کسبِ حلال
کے قابل ہو سکوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصد ہی یہ
تھا کہ انسانی زندگی کو شاندار بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو
خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں۔ اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے
اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا "کسی عرب کی
تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں
سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے"
اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزندِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر
ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دنیوی برکت اور اخروی نجات کی دولت
سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا خود ایک بت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر
کرتا ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں اس کی گوں کی بات کہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے
عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے۔
حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں
اُن کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔

حضور خواجۂ دوجہاں (بابی انت وابی) نے جو اس شعر کی تعریف فرمائی
اس سے صنعت کے ایک دوسرے بڑے اُصول کی شرح ہوتی ہے کہ
صنعت حیات انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی ۔

ہر وہ استعداد جو مبدء فیاض نے فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے
اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے ایک مقصدِ وحید
اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر
چمکے، قوت سے لبریز ہو، جوش سے سرشار ہو، ہر انسانی صنعت اس غایت
آخرین کی تابع اور مطیع ہونی چاہئے اور ہر شئی کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا
چاہئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے ۔ تمام وہ باتیں جن کی
وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش
موجود ہیں (کہ انہیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) اِن کی طرف سے آنکھ پر
پٹی باندھ لیں، انحطاط اور موت کا پیغام ہے ۔ صنعت گر کو چنیا بیگم کے حلقہ
عشاق میں داخل ہونا چاہئے مصورِ فطرت کو اپنی رنگا رنگ نگار آرائیوں کا
اعجاز دکھانے کے لئے افیون کی جھپکی سے احتراز واجب ہے ۔ یہ پیش پا
افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ

کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے انفرادی، اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے
جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے
غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدان حقیقی نے عنترہ کے شعر کی
خوبیوں کا جو اعتراف کیا اُس نے اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے
ہر کمال کی صحیح شانِ ارتقا کیا ہونی چاہئے"۔

بہر کیف ملک میں فطری اور قومی شاعری کے جس پودے کے نصب کرنے میں
بساط بھر کوشش کیجا رہی تھی اُسے مبدء فیاض نے اقبال کے سپرد کیا۔ اقبال نے
اُسے خون جگر سے سینچا اور ایسا سرسبز و شاداب کیا کہ آج وہ ایک تناور درخت ہے
جس کی سایہ دار و ثمر بار شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں چنانچہ مشرقی طرز
ادا کو ہاتھ سے نہ دے کر مغربی شاعری کے معیار کے مطابق مسلسل نظمیں اس
ہونہار شاعر نے الہامی انداز میں لکھنا شروع کیں تو یورپ کے شاعروں کو
بھی مات کر دی اور اپنی شہرت یورپ اور امریکہ تک پہنچا دی۔

شہرت کی بنیاد

سب سے اول اقبال نے احباب کے اصرار اور تقاضے پر ایک طویل
نظم بعنوان "نالۂ یتیم" ۱۸۹۹ء میں لکھی اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے
پندرھویں سالانہ اجلاس میں اپنے مخصوص انداز کے ساتھ پڑھی۔ حاضرین جلسہ

ہمہ تن گوش تھے اُن کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اُن پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری تھی یہ نظم سراپا سوز و گداز اور مجسم درد و تاثیر ہونے کے باعث خاص و عام میں اس قدر مقبول ہوئی کہ ایک دفعہ پڑھی جانے سے تسلی نہ ہوئی اکثر بند بار بار پڑھوائے گئے جن کا اثر سامعین پر یہ ہوا کہ اُن کے سُست پائے عمل چست ہو گئے اور ان کی اخوت و ہمدردی ایسی شکل میں ظاہر ہوئی کہ چاروں طرف سے چندوں کی بوچھاڑ ہونے لگی اور بے کس و بے بس اطفال قوم کے واسطے سیم و زر کا ایک ڈھیر لگ گیا یہاں اس درد انگیز نظم کا ایک بند آپ بھی ایک یتیم لڑکے کی زبانی سنئے۔

زخمِ دل کے واسطے ملتا نہیں مرہم مجھے   اپنی قسمت کا ہے رونا صورتِ آدم مجھے
ظلِ دامانِ پدر کا سبکہ ہے ماتم مجھے   ہاں ڈبو دے اے محیط دیدۂ پرنم مجھے

مضطرب اے دل نہ ہونا شوقِ طفلی کیلئے
تو بنا ہے تلخیٔ اشکِ یتیمی کے لئے

اس نظم نے اقبال کی شہرت کراچی سے رنگون اور کشمیر سے راس کماری تک پھیلا دی انھوں نے رفتہ رفتہ معمولی مشاعروں میں پڑھنا بالکل ترک کر دیا اور اُن کی ایک نئی نظم سے ہر سال انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں کی

رونق بڑھنے لگی" "نالۂ یتیم" کے بعد مختلف جادو اثر محشر خیز نظمیں تصویر درد۔ فریاد امت
ہمارا دیس۔ نیا شوالہ۔ ترانہ۔ شکوہ وغیرہ لکھ کر اقبال اپنی سخن سنجی کا ثبوت دیتے ہے
جیسے جیسے یہ نظمیں اخبار و رسائل میں شایع ہونے لگیں ان کی آسمان پیمائی نازک
خیالی، مضمون آفرینی اور اجتہاد و جدت کے اعتراف کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اور
اکثر شاعر رشک کرنے لگے کہ کاش! ہمارے اشعار بھی اس پایہ کے ہوتے
اور لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ اقبال کی کوئی نظم ادھر
مخزن میں چھپی ادھر تمام اخبار و رسائل نے اس کی ایک دوسرے سے نقل کی
اور اس طرح وہ ملک کے ہر گوشہ میں پہنچ گئی۔ اقبال تعلیم یافتہ اور روشن خیال اصحاب
کے علاوہ ناخواندہ لوگوں میں بھی مشہور و مقبول ہونے لگے۔ چنانچہ ہندوستان
کے ایک اہل قلم تحریر کرتے ہیں۔

"راقم الحروف ایک دفعہ اضلاع کانگڑہ و شملہ کے دشوار گذار پہاڑوں میں
سفر کر رہا تھا وہاں جاہل اور گنوار لڑکوں کو جو پہاڑ کی چوٹیوں اور کھلے میدانوں
میں مویشی چرا رہے تھے یہ شعر عجیب لے میں پڑھتے ہوئے سنا۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

ایک اور قابل ہندو انگریزی زبان میں لکھتے ہیں۔

"ایک دن میں نے ان کی (اقبال کی) ایک غزل نہایت غیر متوقع جگہ پر لکھی دیکھی۔ یہ دیکھکر میں زندگی کی بوقلمونی پر متبسم ہوا اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں میرا یہ آخری تبسم نہیں ہے۔"

مجھے بھی ایسے حیرت زا واقعات کا ذاتی علم و تجربہ ہے جن میں سے دو ایک کا مختصر ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

۱۹۲۵ء میں مجھے ایک شدید علالت کا سامنا ہوا اور تبدیل آب و ہوا کے لئے حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ گرمیوں کا موسم تھا میں والٹیر میں مقیم رہا یہ صوبہ مدراس میں ایک چھوٹا سا شہر لب ساحل واقع ہے اس میں مسلمان بہت ہی کم آباد ہیں اور ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ یہاں اردو بولی جانا تو درکنار اچھی طرح سمجھی تک نہیں جاتی اسی جگہ اسحٰق شاہ نامی ولی کا مزار ایک ایسے بلند پہاڑ پر واقع ہے جس کی خلیج بنگالہ پاشوئی کرتا ہے۔ درگاہ کے متصل ایک مسجد ہے عید الفطر کا موقع تھا میں نے اسی مسجد میں عید کی نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہوکر واپس ہوتے ہوئے میرے تحیر کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے نٹ قوم کے ایک فرد کو دیکھا کہ اس کے گلے میں ایک چھوٹا سا ہارمونیم آویزاں ہے اور وہ نہایت دلربایانہ انداز اور جوش و مستی کے عالم میں یہ اشعار گا رہا ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے — تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پُرانے

زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو — یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دو

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا — رونا ستم اُٹھانا اور اُن کو پیار کرنا

لوگ اُس کے سامنے جھوم رہے ہیں اور بڑھ بڑھ کر اس کی جھولی میں پیسے ڈالتے جاتے ہیں شاعر کے یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے والے نغمے، سمندر کی فضا، بزرگ کی درگاہ، پہاڑ کا دامن، باجے کا ترنم، دیہاتی مطرب کی انگلیوں کا مستانہ رقص، اُس کے لبوں کی بےخودانہ جنبش، اُس کی سُریلی آواز میں لوچ، شارع عام اور اُس کی ہر دکان پر صدا، عید کا روز اور اس کا مسلمان سے سوال، اور اُس کی کوبکو موسیقی آمیز و ترنم انگیز انگشت کے کبھی نہ بھولے جانے والے منظر نے میرے دل میں درد و اثر کا ایک ہجوم اور یہ یقین پیدا کیا کہ اقبال کی آواز صرف اپنی قوم کے لئے صدا بصحرا نہیں بلکہ اقوامِ عالم کی فلاح و بہبود کے واسطے تیر بہدف ثابت ہوگی جس شاعر کا کلام سیکڑوں میل کے فاصلہ پر ایسی جگہ جہاں کی زبان تلنگی ہے اور اُردو برائے نام سمجھی جاتی ہے اس طرح اَن پڑھ لوگوں تک پہنچ جائے اس کی عظمت و مرتبت میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے اس کے ساتھ ہی میرا ذہن اس پر منتقل ہوا کہ ایسے بلند اقبال شاعر

کی دلچسپ شخصیت کا شرح و بسط کے ساتھ پبلک سے تعارف کرانا فرض ولین ہے
اسی جذبہ و ہیجان کا عکس دیباچہ کی یہ چند ناقص سطور ہیں ۔

(۲) خوش قسمتی سے طالب علمی کے زمانہ میں مجھ کو نواب وقار الملک مرحوم
مولوی مشتاق حسین جیسے مجسم خلق و نیکی اور بزرگ و محسن قوم کی صحبتیں میسر آئی
تھیں ۔ آخر دسمبر ۱۹۱۱ء میں ایک دن انھوں نے مجھ سے مسلمانوں کے زوال پر
گفتگو فرمائی تھی ۔ نواب صاحب ممدوح کے الفاظ حافظہ میں بجنسہ محفوظ نہیں ہیں
تاہم اُن سے جو مکالمہ ہوا تھا وہ قریب قریب درج ذیل ہے :-

میں نے کہا "قبلہ ! زوال کے جہاں اور کئی اسباب ہیں میرا ناقص خیال ہے کہ
اُس میں ہمارے ادبیات کا بھی بڑا حصہ ہے بالخصوص فارسی و اُردو شاعری نے
ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے ۔ ایک مثنوی زہر عشق کو ملاحظہ فرمائیے کہ وہ خواہ
جذبات کی کیسی ہی سچی تصویر کیوں نہ ہو، نوجوانوں کو زہر دئے بغیر کیسے رہ سکتی ہے
برعکس اس کے انگریزی نظمیں جو ہمارے نصاب میں داخل ہیں ہم کو ملک و ملت کے
اہم کاموں کے انجام دینے پر آمادہ کرتی ہیں "

نواب صاحب نے متبسم ہو کر فرمایا ۔ " یہ مزخرفات تو ولایت میں کچھ کم نہیں ہیں
وہاں بھی جذبات بہیمیہ کو برانگیختہ کرنے والی نظمیں آپ کو بے شمار ملیں گی اسی لئے

اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں شعرا کو گمراہوں کے طبقہ سے تعبیر کیا ہے ۔

یہ سچ ہے کہ تقریباً نصف صدی سے مہمل شاعری نے علوم و فنون کی تحصیل سے ہماری قوم کو باز رکھا اور لہو و لعب کی جانب مائل کیا ۔ اور چونکہ غزل گوئی اس عرصہ میں کوبہ کو ہوتی تھی ساری قوم کا رجحان شاعری کی جانب ہو گیا تھا اسی رنگ میں اصلاح قوم کے خیال سے اگر مولوی حالی کام کی چیز مسدس (مدو جزر اسلام) نہ لکھتے تو خدا جانے کیا ہوتا ۔ ایک اور بیرسٹر صاحب شیخ محمد اقبال نامی لاہور میں رہتے ہیں ۔ قومی شاعر ہیں ۔ ہم کو آج کل ایسی ہی فائدہ مند شاعری کی ضرورت ہے جیسی کہ ان کی ہے ۔ ان کو چند ہی روز ہوئے کہ دہلی میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے پھولوں کے ہار پہنائے گئے ۔ آپ وہاں موجود تھے آپ نے بھی دیکھا ہوگا ۔ قوم نے ان کی قابلیت کی کتنی بڑی عزت کی ۔ یورپ میں تعلیم پائے ہوئے لوگ ملک میں اسلام کی خدمت کرتے ہیں تو ان کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے ۔ ڈاکٹر اقبال بھی ولایت کے تعلیم یافتہ ہیں قابل ہیں ان کی ذات سے قوم کی بہت ساری توقعات وابستہ ہیں ولایت جانے سے پہلے وہ وطن پرست تھے اور انھوں نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کہا تھا لیکن انگلستان سے واپس آنے کے بعد ان کے

خیالات میں تبدیلی ہو گئی ہے اب وہ مذہب پرست ہیں اور کہتے ہیں۔

"مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

ان کا ایک ترانہ "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" آج کل ہندوستان میں بچے بچے کی زبان پر ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں ان کی نظم "شکوہ" بورڈنگ ہوس میں لڑکے گا گا کر پڑھتے ہیں"۔

میں نے تصدیق کی" جی ہاں یہ صحیح ہے میں نے خود سنا ہے طالب علموں میں جا بجا اس نظم کا تذکرہ ہوتا ہے جب کوئی نیا شخص ان سے ملتا ہے تو اس کو وہ "شکوہ" پڑھ کر سناتے ہیں بعض طالب علم اس نظم کو ایسے شوق و ذوق سے جیسے غزلیں گائی جاتی ہیں گا گا کر پڑھتے رہتے ہیں"۔

پھر نواب صاحب نے ارشاد فرمایا "یہ نیک شگون ہے ہمارا مذہب ہر قسم کی تعلیم اور ترقی کا سرچشمہ ہے مذہبی رنگ کی شاعری ہماری قوم کے نوجوانوں کے واسطے نہایت مفید ہے کیونکہ راست پند و نصائح اکثر سودمند نہیں ہوتے جیسے اشعار کہ فوراً طبیعت پر اثر ڈالتے ہیں۔ "شکوہ" کی سی قومی نظمیں لکھی جائیں تو نوجوانانِ قوم اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف ہو سکتے ہیں اور ان کی طرح خود بھی مذہب کی رہنمائی میں عظیم الشان کام انجام دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کے سے

قابل افراد قوم میں پیدا ہوں تو یقیناً ہماری قوم کی عزت بڑھے گی۔ یاد رکھئے جس قوم میں علم و عمل موجود ہے وہ کبھی مٹ نہیں سکتی۔ لیکن ہاں کیا آپ نے یہ بھی سُنا ہے کہ "شکوہ" کی نظم سے بہت سے مولوی ناراض ہیں اور شاعر کے لئے کفر کے فتوے تیار کر رہے ہیں۔"

میں اس کا کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ نواب عماد الملک بہادر دہلی دربار اور کانفرنس کی شرکت کے بعد حیدر آباد واپس ہوتے ہوئے نواب صاحب کی ملاقات کی غرض سے تشریف لائے اور اس موضوع کا سلسلہ سخن ٹوٹ گیا۔ اس گفتگو سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ مسلمانانِ ہندوستان کے نمائندے اور معتمد الیہ نواب وقار الملک بہادر کے دل میں اقبال کی کس قدر وقعت تھی

(۳) اخبارات و رسائل اقبال کے اشعار سرلوح شائع کر کے اپنے اپنے نصب العین کا اظہار کرتے ہیں ایک اخبار ذیل کا شعر

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

لکھتا ہے اور دوسرا یہ شعر

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں — خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

ایک اردو رسالے کے سرورق پر یہ مصرع

یک صبح چمن ز روزگارے خوش تر

درج ہے اور دوسرے پر یہ شعر

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا ۔۔۔ بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے

لکھا ہوا ہے۔

(۴) ہندوستان کے کالجوں میں کلبوں میں سوسائٹیوں میں اُن کے اشعار پر بحث مباحثے ہوتے ہیں اور ان کی نظموں کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔ قومی گیت کا کام دیتی ہیں مثنوی معنوی کے اشعار کے مانند جلسوں وعظوں تقریروں اور لکچروں میں پڑھی جاتی ہیں اور نوجوانوں کی محفلوں میں گائی جاتی ہیں۔

(۵) ان کے مختلف اشعار کی شرح مشرق کے مایۂ ناز مصور عبدالرحمان چغتائی نے مختلف تصاویر کے ذریعے کی ہے اِن میں سے ایک نہایت نفیس تصویر "اسرارِ حیات" اقبال کے اس شعر

کند تلواریں ہوئیں عہدِ زرہ پوشی گیا ۔۔۔ جاگ اُٹھ تو بھی کہ دورِ خود فراموشی گیا

کی ترجمان ہے اور لاہور کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہے۔ ان سب واقعات سے اقبال کی ہر دل عزیزی ثابت ہوتی ہے۔

(۳)

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے اقبال کی ادبی خدمات کا اعتراف

سنہ ۱۹۱۱ع میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے یہ حق بجانب فیصلہ کیا تھا کہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے جو اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں اُن کا اعتراف ملک و قوم کی جانب سے کرنے کے لئے اُن کو مدعو کیا جائے چنانچہ انھوں نے دعوت قبول کی اور دہلی آکر کانفرنس کے تیسرے جلسہ کی کرسی صدارت کو رونق بخشی۔

اس جلسہ میں مولوی خواجہ کمال الدین صاحب اسلام اور علوم جدید پر ایک لکچر دیتے ہوئے ڈاکٹر اقبال سے جوش و خروش کے ساتھ یوں مخاطب ہوئے تھے۔

کہاں ہے تو ڈاکٹر اقبال خدائے تعالیٰ تجھے دین و دنیا میں باقبال کرے۔ تیرے نادر قوائے ذہنی ابھی دنیا کی نظر سے چھپے ہوئے ہیں تجھ میں وہ ذہنی قابلیتیں اور استعدادیں ہیں کہ ان کا ٹھیک استعمال تعالیٰ دوام کا تاج تیرے سر پر رکھ سکتا ہے۔ یقین ہے خاص تجلی تو نے تجھے اس لئے نہیں عطا ہوئے کہ تو گل گشت و ڈیلیوں کا مصداق بن کر ایک بے ثمر باغ میں جس کا نام مشاعرہ ہے گلگشت کرے۔ اب وقت ہے کہ تو حقیقی میدان عمل

بن۔ عالم سفلی کو چھوڑ اور عالم قدس ہو جا۔ جرمن کی یونیورسٹی میونک کا قرضہ تیرے ذمہ ہے
اور تو ہی اس قابل ہے کہ اس قرضہ کو معہ سود ادا کرے۔ تجھے اگر مغربی حکمت و فلسفہ
انھوں نے سکھا کر ڈاکٹر کا خطاب دیا تو یہ قرضہ ترانوں اور نغموں سے ادا نہیں ہو سکتا
اس کا معاوضہ یہ ہے کہ تو قرآن کو کھولے اور اُس کے دریائے حقیقت میں غوطہ لگا دے
اور اس سے حکمت و فلسفہ حقہ کے دُر شہوار نکال اور بینڈیٹ شا اور ہزل کی آنکھوں کو
چکا چوند کر دے کیا یہ بات درست ہے جو چند دن ہوئے اٹلی اور ٹرکی کی جنگ کے متعلق
کچھ دیتے ہوئے اس بیسویں صدی کے ایک شقی ازلی تھر لیڈن نے کہے اور ہمارے
دل کو کباب کیا کہ اسلام ہمیشہ ہی سے مُردہ تھا اور اس سے نسل انسانی کو کبھی کوئی فائدہ نہیں
پہنچا اور یہ کہ اسلام کا نام و نشان مٹنا ہی اچھا ہے۔ یہ ایک جرمن کے سامنے اُن کو
دھوکا دینے کے لئے اور اُن کے گناہ میں اٹلی کی قزاقی کا جواز ثابت کرنے کے لئے اس بیسویں
صدی کا بڑے سے بڑا کذب بولا گیا۔ کیا یہ بہتر سے بہتر وقت جرمن کا قرضہ اُتارنے کا
نہیں دیکھ یورپ یا اور اس کا فلسفہ کیا یہ سب کا سب مال مسروقہ ہے اور بیرسٹر اقبال! آ میرے ساتھ
وکالت میں شامل ہو اور ہم بحیثیت منصبی اس مال کو اپنے گھر کا مال مسروقہ ثابت کریں تجھے

ے خواجہ صاحب اور اُن کے ساتھ تمام عام و خاص یہ معلوم کر کے بہت مسرور ہوں گے کہ اقبال نے
"پیام مشرق" کی بے بہا تصنیف سے یہ قرضہ معہ سود بلکہ سود در سود ادا کر دیا ہے۔ ۱۲

خدائے تعالیٰ نے بے نظیر قابلیتیں اس لئے نہیں دیں کہ تو عشقیہ موسیقی میں پڑے اور اپنے شعروں سے ہمیں خوش کرے۔ تیرے گانے کا یہ وقت نہیں۔ یہ عمل کا مرکا وقت ہے وہ بار جو قوم تیرے گلے میں عملاً ڈال رہی ہے اور تو اس کا حقیقی طور پر مستحق ہے وہ ان گلشن فردوس بریں کے مقابل کیا حقیقت رکھتے ہیں جو خدمت قرآن تیرے لئے وقف کرسکتی ہے۔ قوم تجھے ملک الشعرا بنانا چاہتی ہے اور وہ ایسا کرنے میں غلطی پر ہے اور پست ہمت ہوگا اگر اس پر قانع ہوا۔ میں تجھ میں غزالی اور رازی کا ہم زاد دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ تو بھی کسی کی طرح بیرونی زبانی میں منہمک ہو جائے۔"

اس لکچر کے اختتام پر اقبال نے جو تقریر کی وہ سن لیجئے کہ ان کی نثر میں بھی شاعری ہے

"خواجہ صاحب نے جو تقریر اس وقت کی ہے وہ نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے......

اس زمانہ میں مسلمانوں نے اس بحث پر بہت کچھ لکھا ہے کہ اسلام اور علوم جدیدہ کے مابین کیا تعلق ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں جب سے کہ یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا یورپ میں علم کا چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا تھا۔ ان یونیورسٹیوں میں مختلف ممالک یورپ کے طلبہ آکر تعلیم حاصل کرتے اور پھر اپنے اپنے ملکوں میں علوم و فنون کی اشاعت کرتے تھے۔ کسی یوروپین کا یہ کہنا کہ "اسلام اور علوم

یک جا نہیں ہو سکتے" سراسر نا واقفیت پر مبنی ہے اور مجھے تعجب ہے کہ علوم اسلام اور تاریخ اسلام کے موجود ہونے کے باوجود کوئی شخص کیونکر کہہ سکتا ہے کہ علوم اور اسلام ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ بیکن۔ ڈی کارٹ اور مل یورپ کے سب سے بڑے فلاسفر مانے جاتے ہیں جن کے فلسفہ کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ڈی کارٹ کا میتھڈ بعینہ اصول امام غزالی کی احیاء العلوم میں موجود ہے اور ان دونوں میں اس قدر تطابق ہے کہ ایک انگریزی مؤرخ نے لکھا ہے کہ اگر ڈی کارٹ عربی جانتا ہوتا تو ہم ضرور اعتراف کرتے کہ ڈی کارٹ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے۔ راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا۔ جان اسٹوارٹ مل نے منطق کی شکل اول پر جو اعتراض کیا ہے بعینہ وہی اعتراض امام فخر الدین رازی نے بھی کیا تھا اور مل کے فلسفہ کے تمام بنیادی اُصول شیخ بو علی سینا کی مشہور کتاب شفاء میں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ تمام وہ اُصول جن پر علوم جدیدہ کی بنیاد ہے مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں بلکہ میرا دعوےٰ ہے کہ نہ صرف علوم جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کی زندگی کا کوئی پہلو اور اچھا پہلو ایسا نہیں ہے کہ جس پر اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو۔"

اس سال کانفرنس میں اعیان و ارکانِ سلطنت رہبران و فرماں روایان ہند اور دیگر اکابر قوم و ملک شریک تھے اُن کے سامنے اقبال کی تعظیم کی رسم اجلاس

ششم میں اس طرح شروع ہوئی۔

علامہ شبلی قوم کی جانب سے اقبال کو پھولوں کا ہار پہناتے ہیں۔

قوم کے ایک بڑے واعظ مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری صدر نشین جلسہ تھے مصنف خیالستان نے اقبال کو پھولوں کا ہار پہنانے کی علامہ شبلی سے درخواست کی علامہ موصوف نے اس خوش گوار فرض کو بہ طیب خاطر ادا کرتے ہوئے یہ مختصر تقریر فرمائی اور اس کے بعد اقبال کے گلے میں ہار ڈالا۔

" یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں ہے اور اس کو محض تفریح نہ تصور کرنی چاہیئے ہم مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے رہتے ہیں اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوئی محقق طوسی وغیرہ کو اُس زمانہ کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دئے لیکن آج سر کتابوں کے اوراق کے کسی کی زبان پر نہ چڑھ سکے۔ لیکن قوم کی طرف سے " محقق " کا جو خطاب دیا گیا وہ آج تک زبان زد خاص و عام ہے جو عزت قوم کی طرف سے آج ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ اُن کے لئے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس عزت کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کا علم ادب اور اُن کی شاعری کا معیار غالب کی شاعری سے کیا جائے تو مبالغہ نہیں ہو سکتا۔"

اقبال نے اس عزت افزائی کے لئے قوم کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ :-
"میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھ کو
پان اسلامزم کی تحریک پھیلانے والا بتلایا جاتا ہے مجھ کو پان اسلامسٹ ہونے کا
اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن
اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا شرک اور باطل پرستی دنیا سے
ضرور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی اس مشن کے متعلق
جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے اپنی نظموں کے ذریعے سے قوم تک پہنچانا چاہتا
ہوں اور اس اسپرٹ کے پیدا ہونیکا خواہشمند ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھی
کہ باوجود دولت و امارت کے وہ اس دار فانی کی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ میں جب
کبھی دہلی آتا ہوں تو میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی رح
کے مزار پر جایا کرتا ہوں اور وہاں کے دیگر مزارات وغیرہ پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں
میں نے ابھی ایک شاہی قبرستان میں ایک قبر پر الملک للہ کا کتبہ لکھا ہوا دیکھا
اس سے اس اسلامی جوش کا اظہار ہوتا ہے جو دولت اور حکومت کے زمانہ میں
مسلمانوں میں تھی جس قوم اور جس مذہب کا یہ اصول ہو اس کے مستقبل سے ناامیدی
نہیں ہوسکتی اور یہی وہ پان اسلامزم ہے جس کا شائع کرنا ہمارا فرض ہے اور اس قسم کے

خیالات کو میں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا ہوں۔"

اقبال حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواری کی مقدس نظروں میں۔

اس کے بعد صاحب صدر نے اپنی اختتامی تقریر میں ہمارے بے مثل شاعر کے متعلق یہ کلمات کہے۔

"ایک اور قابل ذکر امر میرے عزیز دوست فخر قوم پروفیسر اقبال صاحب کو اُن کی قومی شاعری کی سند میں پھولوں کے ہار پہنائے جانے کا بھی ہے اس کے متعلق میں قرآن کیا فیصلہ دوں وہاں تو فرمایا گیا والشعراء یتبعھم الغاوٗن الآیہ۔ مگر نہیں نہیں یہ تو ایام جاہلیت کے اُن شعرا کی نسبت کہا گیا ہے جن کی شاعری کا مایہ ناز ہزلیات، ہجو و مذمت اغیر مہذب اور مخرب اخلاق باتیں تھیں۔ لیکن ڈاکٹر اقبال اُن شاعروں میں ہیں جن کو اسی آیت کے آگے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الآیہ سے مستثنےٰ کردیا گیا۔ یہ اُن لوگوں میں ہیں جن کی شان یہ بتائی گئی کہ فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ۔ مسٹر اقبال تو احسن القول والے ممدوح شاعر ہیں ان کی قومی شاعری اب اس عام قبولیت کو پہنچ گئی ہے کہ قومی جلسوں میں، مولود اور وعظ کی محفلوں میں اُن کے قومی ترانے اور اُن کی نعتیہ نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ اقبال کی شاعری کا رنگ ڈھنگ اگلے شعرا سے نرالا ہے اگلے شاعروں کی سخاوت و دریا دلی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ محبوب کے خط و خال پر سمرقند و بخارا نثار کرتے تھے

ع بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اگرچہ اب یہ ملک چونکہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر روس کی عملداری میں ہے اس لئے یوں کہنا زیبا ہے "بخالِ روسیہ بخشم سمرقند و بخارا را" مگر پروفیسر اقبال صاحب کی عالی خیالی سنئے کہ ایک طرف تو طرابلس قبضہ سے نکلا جاتا ہے' ایک طرف ایران معرضِ خطر میں ہے مگر ان کا ترانہ یہ ہے کہ زمین ہماری' آسمان ہمارا' چین ہمارا، ہند و جاپان ہمارا یہاں تک کہ

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

خیر ہم بھی کہتے ہیں کہ خدا کرے سارا جہان تمھارا ہو جائے اور کوئی نہ ہو تو ہم تمھارے ہیں بہرحال میرے خیال میں اُن کی قومی شاعری فقط پھولوں کا ہار پہنانے اور زبانی شکریہ ادا کرنے سے کہیں بالاتر ہے۔ یہ ہمارے موجودہ اسلام کے حسّان ہیں۔ فرزدق ہیں لیکن ہاں ان دونوں معزز خطابوں میں سے حسان الہند کا خطاب تو علامہ میر آزاد بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ بہت پہلے حاصل فرما چکے ہیں لہذا میں مسٹر اقبال کو "فرزدقِ ہند" کہتا ہوں جو ان کے لئے اس وجہ سے بھی نہایت مناسب و موزوں ہے کہ جس طرح فرزدق محبِ عترت اور شاعرِ اہلِ بیت تھا اسی طرح اقبال بادۂ تولائے اہلِ بیت سے مست و سرشار ہیں اور اولیاء اللہ کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی ہے جس کا اندازہ خود اُن کے بیان سے آپ لوگوں نے کرلیا ہوگا۔

اقبال صاحب کے لئے یہ موقع بہت ہی مبارک ہے اور ہمیں بھی بڑی مسرت ہے کہ اس جلسہ میں انھوں نے علامہ شبلی کے مقدس ہاتھوں سے پھولوں کے ہار پہنے۔ نام بھی مبارک کام بھی مبارک، پھولوں کا ہار بھی مبارک اور ہار ڈالنے والے کا دست کرم بھی مبارک

اے سراپایت وجود تو خوش و نامِ تو خوش | وقت تو خوش شب خوش صبح تو خوش شام تو خوش
جام بلوریں مے رنگیں حنائی دستِ تو | ساقیا دست تو خوش صہبا خوش و جامِ تو خوش

۳

یہہ سارا اعزاز اقبال کو مسلمانوں کی جماعت نے بخشا۔ اب ذرا یہہ دیکھئے کہ انفرادی طور پر نکتہ سنجانِ ہند کے دلوں میں ان کی کتنی عزت و محبت جاگزیں ہے

(۱) ہندوستان کے ایک مضمون نگار لکھتے ہیں کہ:-

"اقبال روحانی شانتی کا منادی ہے۔ اقبال کی دنیائے شاعری بالکل نرالی ہے' وہ مجاز کی پروا نہیں رکھتا صرف حقیقت کی طرف دیکھتا ہے مجاز اور حقیقت کے امتیاز سے اُس کی آنکھیں ہر وقت پرنم رہتی ہیں ع اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہے وہ۔ اقبال کے لئے دنیا کی ظاہری ترقی ایک فنا ہونے والی شئے ہے اور وہ کسی اور چیز کا متوالا ہے۔ اُسی کی تلاش و جستجو میں وہ سرگرداں رہتا ہے اور جب اُسے نہیں پاتا تو رو دیتا ہے اور اُس کی آہ و زاری اشعار بن جاتی ہے۔ اقبال اُس بلبل کی مثال ہے

جس کو سینے پر اپنی نفس معلوم ہوتے ہیں اگر بطرز معاشرت میں قوم کو قید فرنگ سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے
اقبال قید حیات سے کنارہ رہتا ہے، وہ زندگی کو ایک منزل خیال کرتا ہے آخرت کی۔ موت کو
زندگی جاودانی کی ابتدا سمجھتا ہے۔ موت سے بھی اُسے لڑنے میں عار نہیں اور اپنے خدا سے بھی حق پر
حجت و تکرار کرنے میں اُسے تامل نہیں وہ روحانی نجات کو بخشش ربانی کی طرح نہیں مانگتا، وہ اپنے
آپ کو اور اپنی قوم کو اس کا اہل اور حقدار بنانا چاہتا ہے، وہ کبھی کبھی خدا کے سامنے دست سوال
پھیلاتا ہے لیکن ہمیشہ بے نیازی اور خود داری کا پہلو لئے ہوئے۔ اس کی مثال اُس فقیر بے نوا کی
سی ہے جو اپنی نفس شناسی عزت نفس اور صدق عقیدت کی بضاعت رکھتا ہے اور اسی لئے وہ اپنی روح
پر فتوح کی عظمت سے واقف ہے"۔

(۲) مولوی محمد عبدالستار نائب تحریر کرتے ہیں:-

"ہندوستان کی شان نبوت دکھانے والی صرف دو چیزیں ہیں بھگوت گیتا اور کلام اقبال.....
سعدی ہند حالی نے ملک میں جس قومی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی اس کو اقبال نے فلک الافلاک
تک پہنچا دیا....... غالب کے انداز بیان اور زبان میں جو لطافت اور حلاوت ہے وہ اقبال
میں نہیں ہے تاہم اقبال غالب کی طرح بزم سخن میں ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوتا ہے اور سامعین کے
دلوں پر اپنے طرز کلام کا سکہ بٹھا دیتا ہے......... اقبال کی شاعری میں فلسفہ ہے" ہوا کرے،
میں تو اس کے سارے کلام کو فرقان حمید کی نقطان دو آیات شریفہ کی تفسیر سمجھتا ہوں۔

(۱) وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

(۲) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

(۳) مولانا تاجور کے نزدیک :۔

"ایشیائی شاعری جس رفیع شخصیت اور جن دل گداز جذبات پر ہمیشہ فخر کرے گی وہ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت اور اُن کے جذبات ہیں۔ زمانہ ہزاروں کروٹیں لے گا لیکن صدیوں میں ایسے دل و دماغ کا انسان ایسے شاندار جذبات کا مخترع ایسا یگانہ اہل دنیا پیش کر سکے گا۔"

مدیر نیرِ اعظم کی نظر میں :۔

"صدیاں گزریں کہ اس سوز و گداز سے لکھنے والا قلم ایشیا میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ پیش گوئی بیجا نہ ہوگی کہ ایک صدی بعد اسلامی دنیا اقبال کے کلام کو اپنے قومی لٹریچر کا سب سے بیش بہا اور اُردو کا سب سے زیادہ عزیز ترانہ تصور کرے گی"۔

(۴) حلقۂ دہلی کے مشہور پیرِ طریقت خواجہ حسن نظامی تحریر فرماتے ہیں:۔

"لاہور میں سیالکوٹ کے رہنے والے ایک آدمی رہتے ہیں جن کا نام محمد اقبال ہے اور ڈاکٹر ہے اور بیرسٹر ہے اور پی ایچ۔ڈی ہے۔ وہ شعر گاتے ہیں شعر بجاتے ہیں اور موقع پاتے ہیں تو شعر پیدا کر لیتے ہیں۔ میں نے اُن کو آدمی اس ڈر سے کہا کہ جو لوگ آدمیت کی عینک لگائے ہوئے ہیں اور اقبال ان کو آدمی ہی نظر آتے ہیں۔ کہیں وہ مجھ سے ثبوت نہ مانگ

بیٹھیں ورنہ میں اقبال کو پیکر خاک نہیں سمجھتا اور اُن کے پتلے کو آدم زاد نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ وہ بشر ہوں مگر اُن کی بشریت فقط اُن کے بیوی بچوں یا اُن کے لئے مبارک ہو جو اُن کو گوراچٹا موچھوں والا عقلمند پروفیسر بیرسٹر کہتے ہیں۔

میں نے پروفیسر اقبال کو بھی دیکھا ہے اور ڈاکٹر اقبال کو بھی۔ سیالکوٹی اقبال کو بھی اور لاہوری اقبال کو بھی۔ یوروپین اقبال کو بھی اور لندنی اقبال کو بھی وہ ازل سے حیوان ہیں اور حیات ابدی کے نشان ہیں۔ ہندوستان کے آدمی حیوان کے لفظ کو مکروہ جانتے ہیں مگر میں اس لفظ میں وہ جان پاتا ہوں جو ہند کے کسی انسان میں نہیں۔ برسات میں مکھیاں اور پروانے دونوں پیدا ہوتے ہیں اور دونوں جاندار کہلاتے ہیں۔ مگر ایک آدمی کو ستاتا ہے اور مگس بے حیا کا نام پاتا ہے اور دوسرا شمع کے رُخ پر قربان ہو جاتا ہے اور عبرت ڈھونڈنے والوں کو صبح کے وقت اپنی لاش دکھا کر رُلاتا ہے اقبال بھی ایک پروانہ ہے جو اَن دیکھی شمع کا دیوانہ ہے مکھیاں اس کے اشعار کو مٹھاس سمجھ کر چاٹتی ہیں اور پروانے شعلہ سمجھ کر قربان ہونے آتے ہیں۔ اقبال ہمیشہ آسمان پر اُڑتے ہیں، زمین پر کبھی آنا ہوتا ہے تو اُس زمین پر جو آسمان سے زیادہ دور ہوتی ہے اس لئے وہ لوگ جن کے پاس ہوائی جہاز نہیں ہیں یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ اقبال کہاں ہیں؟ ہم اُن تک کیونکر پہنچیں؟ ایک دن بھری سبھا کے اندر اقبال زمین پر

آئے اور چند جملے اُن کی زبان میں سنائے جو زمانہ کی زبان کہلاتے ہیں جن کا نام اکبر ہے
اقبال نے اکبری زبان میں جو کچھ لکھا ہے وہ اکبری اقبال ہے خلقت اُس کو دیکھتی ہے
کہ اقبال نے کس حد تک اکبری روش کو نباہا ہے اور اکبر کی طرح کیونکر تنگ قافیوں کو کشادہ
کیا ہے۔ مگر دیکھنا یہ تھا کہ زمانہ اکبر کی زبان میں بولتے بولتے اب اقبال کی زبان میں
بھی آیا ہے۔ خدا خیر کرے دیکھئے ان حروف کے پردے سے کیا نکلنے والا ہے۔

ہندوستان کی بیقراری میں کام کی باتیں درکار ہیں جن میں نتائج ہوں اور چلنے
کے لئے راستہ ہو۔ عبرت کے لئے دل خوش کن آگاہی و تنبیہ ہو۔ اکبر و اقبال کا ابتک
یہی شیوہ رہا ہے مگر اقبال نے اور طریق سے کہا اور اکبر نے اور پیرایہ سے۔ اس نظم[1] میں اقبال نے
اکبری نقشِ قدم پر پاؤں اٹھایا ہے اور حق یہ ہے کہ مضبوطی سے ہر نشان پر پاؤں جمایا ہے
مجھ سے کہتے ہیں کہ میں اس نظم پر وہ لکھوں جس کو لوگ ریویو کہتے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں
کہ بہتے ہوئے دریا کی روانی کو اس کی کیا ضرورت ہے کہ دوسرا اس کی تیز بہاؤ کی حقیقت
لکھ کر دے۔ موجیں مارنے والا سمندر جب خود نظر آتا ہے تو کسی کا یہ کہنا کہ کشتیاں چکر کھائیں گی
سواریوں کو چکر آئیں گے بادل اُٹھیں گے اور زمین پر مینہ برسائیں گے، فضول ہے۔
جاننے والے خود جانتے ہیں کہ یہ طوفان کسی موسم کی خبر دیتا ہے اس واسطے میں اس

[1] یعنی وہ اشعار جو عنوان "نکات" کے تحت اس کتاب میں درج کئے گئے ہیں۔

نظم کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا اور نہ کہنا ہی اس کی اعلیٰ شان کی دلیل ہے"۔

(۵) مدیر "مخزن" شاعری اور قومی مفاد پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہم اپنے اساتذہ میں بڑے بڑے نام پاتے ہیں۔ انیس مرحوم کی رزمی شاعری بے شک اس قابل ہے کہ یورپ اُس سے روشناس کرایا جائے غالب کے فلسفیانہ جذبات ہر طرح قابلِ عزت ہیں۔ مولانا حالی نے سادہ طرز ادا میں زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔ داغ کی خدمت بھی کم نہیں ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کا فلسفیانہ رنگ بڑی عزت کے قابل ہے یہ سب کچھ تو ہے مگر وہ کون ہے جس نے اُس عروج، اُس رفعت پر جانے کا رخ کیا ہے جو حقیقی شاعری کی منزلِ مقصود ہے؟ اور وہ کون ہے جس میں اُس کی پوری صلاحیت موجود ہے؟ وہ صرف ایک ہی شخص ہے اور اُس کا نام ڈاکٹر اقبال ہے"۔

(۶) نواب سر ذوالفقار علی خاں بہادر نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک سالانہ جلسہ میں اقبال کو سعدی و شکسپیر سے تشبیہ دی تھی اور یہ کہا تھا کہ

"اگر یہی اقبال ولایت میں ہوتا تو اُس کی قدر و منزلت شکسپیر سے بھی بڑھ کر ہوتی۔ مگر افسوس کہ ہمارے اہل ملک اس کی قابلیت تامہ سے کم آشنا ہیں۔ اس کی دنیوی زندگی کے بعد معلوم ہوگا کہ اقبال کیا چیز تھا"۔

نواب صاحب ممدوح نے انگریزی زبان میں تقریباً پچاس صفحات کی

ایک کتاب لکھی ہے[1] اُس کی یہ نہایت مختصر، پرجوش تمہید اقبال کی عظمت کا پتہ دیتی ہے:۔

"اقبال کے رسیلے نغموں کو مغربی ذہن کی بارگاہ میں جو رسائی اب تک نہیں ہوئی اس کا سبب اُن کی وہ بے حد حیا ہے جس نے اُن کو اپنی نظموں کی اشاعت کی اجازت دینے سے باز رکھا۔ یہ امر کہ ہندوستان کا ایک مایۂ ناز فرزند جو دنیائے خیال میں زبردست توجہ پیدا کر سکتا ہے' اب تک بیرونی دنیا سے روپوش رہا ہو فی الحقیقت تمدن کی ترقی میں ایک خسران ہے۔ اگر ایران تخت طاؤس پر نازاں ہے اور اگر تاج برطانیہ اپنے کوہ نور پر فخر کرتا ہے تو بے شبہ اقبال بھی ہر ملک کے دربار علم کا درخشاں گوہر ہے ان کا پیام مستقبل کے لئے ایک اُمید ہے۔ خصوصاً زوال یافتہ اور درماندہ قوموں کے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے وہ بمنزلۂ سنگ بنیاد ہے۔ پژمردہ اقوام کے لئے اُن کے پیام اکسیر ہے اور جارحانہ شہنشاہی کے لئے ایک تنبیہ ان کے فلسفہ کے مطابق روح انسانی چونکہ توانائی کی ایک جوہر فرد ہے اس لئے بے انتہا وسیع ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس اخلاقی تربیت کو بطیب خاطر قبول کرے جس کو انھوں نے اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ ان کی نظموں نے اہل ہند کے دلوں کو تڑپا دیا ہے جب ساری کی ساری

[1] یہ کتاب دیباچہ کی ترتیب میں عزیزی عبدالستار بی اے کے اکثر پیش نظر رہی ہے ۱۲

قوم گہری نیند سو رہی تھی اور اخلاقی ترقی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، جب کئی پشتوں سے
تہذیب اور تمدن کے اعلیٰ طبقوں میں مذہب سے حقارت، شرافت کا معیار سمجھی جاتی
تھی (اور یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ قوم کی روح تنگ خیالیوں کے اثر سے کس قدر مسحور تھی)
تو شاعر نے اعلیٰ جذبات اُبھارے اور مادرِ وطن کے فرزندوں میں ایک طرح کا فخر پیدا کر دیا
اور اہلِ ملک اب اپنی شان و شوکت کے خواب دیکھنے لگے، نوجوانانِ وطن نے محسوس
کر لیا کہ دناءت و پست ہمتی عظمت کے منافی ہے، چنانچہ انھوں نے شاعر کی طرح اس بات کا ارادہ
کر لیا کہ بجائے زمانہ کا ساتھ دینے کے خود زمانہ کو اپنے ساتھ لے لینا چاہیئے۔"

(د) علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں، اُن کا مطالعہ
لطف سے خالی نہیں۔

"ہمارے نزدیک ٹالسٹائی کے نظریہ آرٹ میں من حیث المجموع صحیح و پختہ نصب العین کے عناصر
موجود ہیں کیونکہ فی الحقیقت آرٹ عوام سے بے التفات و بے نیاز ہو کر اپنے وجود کو کماحقہٗ
حق بجانب نہیں ثابت کر سکتا مگر کم از کم ہندوستان میں جہاں طبقۂ عوام جہل و نادانی کی گہری
ظلمتوں میں گھرا ہوا ہے، ملک کے علمی و ادبی ضمیر کا نازک اور مقدس فرض اس نااہل اور غیر
ذمہ دار طبقہ کو تفویض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پھر ہم کہتے ہیں کہ اس کے باوجود ہندوستان کے
ادیب و شاعر محض اس عذر پر اُن سے بے توجہی برتتے ہیں حق بجانب نہیں ہو سکتے کہ ملک کے

عوام جاہل اور بدمذاق ہیں ایسے ممالک میں جن کی تمام تر جد و جہد وسیع و مکمل تر زندگی کی راہیں تلاش کرنے کے لئے وقف ہو آزاد ممالک سے کہیں زیادہ اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ عوام کو اس جد و جہد کے مقاصد سے پہلے آگاہ اور پھر متاثر کیا جائے تا کہ وہ محسوس کر سکیں کہ اُن کے گرد و پیش جو ذہنی معاشری اور سیاسی ہل چل بپا ہے اس کا اُن کے مفاد و اغراض سے براہ راست یا بالواسطہ کیا تعلق اور رشتہ ہے یہ لابدی ہے کہ عامۃ الناس ان باتوں کو بخوبی سمجھ سکیں کیونکہ جیسا کہ حکیم حیات علامہ اقبال "پیام مشرق" کے دیباچہ میں فرماتے ہیں "زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو" تغیر و تبدل، تعمیر و انہدام کے اس طوفانی و پُر آشوب زمانہ میں علم ادب بالخصوص شاعری کا سب سے بڑا فرض عوام کے ضمیر میں اس نئی دنیا کا مفہوم اور اہمیت واضح اور روشن کرنا ہے جو بقول علامۂ موصوف "فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے"۔

اقبال کی شاعری چونکہ اس نصب العین پر پوری اترتی ہے اس لئے ہماری نظروں میں اقبال اسی طرح حقیقی معنوں میں شاعر ہیں جس طرح گوئٹے نپولین کی نظروں میں انسان تھا اس پر بعض اصحاب چیں بجبیں ہوں گے کہ شاعری سے کسی قسم کی تلقین و تعلیم کا کام لینا کو

آلودہ کرنے کے مرادف ہے۔ یہ حضرات فنونِ لطیفہ کے جس میں شاعری کو بھی شمار کیا جاتا ہے حق "آزادی" کی تائید میں یہ قول پیش کرتے ہیں کہ آرٹ کو آرٹ کی نظر سے جانچنا چاہئے کاش انہیں معلوم ہوتا کہ اس فرسودہ اور مبہم نظریہ کا انگریزی ادب پر آخری صدی کے ربع آخر میں بالخصوص کیسا زہریلا اور مہلک اثر پڑا ہے اور وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ تمام تخلیقی فنون نظام و پابندی کے طلب گار ہیں۔ شاعری دراصل تخیل و احساسات کے ذریعے زندگی کی ترجمانی کا نام ہے۔ اس لئے اس کی عظمت کا اندازہ اس قدرت و قوت سے کرنا چاہئے جو وہ زندگی کے ان مہتم بالشان اور ابدی مسائل پر روشنی ڈالنے میں صرف کرتی ہے جن کا تعلق انسان کے ارفع ترین محسوسات اور مفاد سے ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ شاعری چونکہ ایک آرٹ ہے اس لئے اس کو محض فن کے اعتبار سے جانچنا بھی ضروری ہے۔ لیکن ہمیں یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ آخر فن شاعری روح کا مظہر اور جذبات و احساسات کے اظہارات کا ایک ذریعہ ہے اور بدیہی طور پر اس کی اہمیت کا انحصار اس روح اور ان احساسات پر ہے جن کا یہ فن شریف مظہر و ترجمان ہے اس سے ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں کہ شاعری کی عظمت کسی مخصوص پیغام یا مسلک کی اشاعت پر منحصر ہے یقیناً براہ راست وعظ و تلقین، رشد و ہدایت کا تعلق ناصحین سے ہے۔ شاعری کا فرض اور غایت محض خوابیدہ کرنا، روح پھونکنا اور محظوظ

کرتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم شاعری کے "آزاد" ہونے کی بزور مخالفت کرتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک مشہور شاعر و نقاد میتھو آرنلڈ کے الفاظ میں "شاعری تہ میں زندگی کی ایک تنقید ہے اور کسی شاعر کی عظمت کا مدار اس امر پر ہے کہ وہ کس طرح قوی اور خوبصورت پیرایہ میں حیات پر خیالات کی روشنی ڈالتا اور اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کس طرح بسر کی جائے۔ جو شاعری اخلاقی خیالات سے بغاوت کرتی ہے وہ زندگی سے بغاوت کرتی ہے، جو شاعری اخلاقی خیالات سے بے اعتنائی برتتی ہے وہ زندگی سے بے اعتنائی برتتی ہے"۔ یہاں بھی ضروری ہے کہ یہ حقیقت زیر نظر رکھی جائے کہ اخلاقی خیالات کا تعلق سوال مذکورالصدر کے جواب سے ہے نہ کسی خاص مذہب یا فرقہ کے مخصوص و محدود معتقدات سے۔

بعض حضرات کو معلمانہ شاعری کی طرح فلسفیانہ شاعری پر بھی اصولی اعتراض ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ مسائل فلسفہ کو شاعری میں داخل کرنا شاعری کو خشک، ٹھوس اور ثقیل بنانا ہے ہماری رائے میں یہ الزام صرف ناظم فلسفیوں کے کلام پر عائد کیا جاسکتا ہے جو فلسفہ یا اخلاقیات کی خشکی یا ثقالت کو تخیل کی شگفتگی و رنگینی میں تحلیل کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور اپنے خیالات کو حقیقی شاعرانہ لباس میں جلوہ گر نہیں کرسکتے اس اعتراض سے وہ شاعر بلند اور بری ہیں جو معنی و اظہار کو مکمل حسن و رنگینی و ترنم کے ساتھ ایک دوسرے

میں پیوست کر سکتے ہیں مثلاً گوئٹے ، غالب و اقبال ہی کو لیجئے ورڈس ورتھ کی طرح اقبال کی بھی یہ خواہش ہے کہ وہ شاعر سے زیادہ معلم اور فلسفی سمجھے جائیں کیونکہ کیٹس، شیلی وغیرہ پرستاران حسن کے مسلک "حسن آئینہ حق" کے خلاف ان کے نزدیک "حق آئینہ حسن" ہے اور شعر آئینہ دار حسن ہونے کے بجائے آئینہ دار حقؔ۔ چنانچہ ان لے تھوں سے بگڑ کر جو ان کے کلام کو محض شاعری کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں لکھتے ہیں :-

من شکوہ خسروی اورا دہم	تخت کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیث دلبری خواہد ز من	آب و رنگ شاعری خواہد ز من
کم نظر بیتابی جانم ندید	آشکارم دید و پنہانم ندید

لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس معلم و فلسفی کی حقایق آمیز شاعری جس کا ایک بڑا مقصد فرسودہ سست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی "عجمیت" کے خلاف فلسفیانہ جہاد ہے ۔ مذہبی، اخلاقی اور ملی حقائق کو مبلغ محض کے روکھے پھیکے انداز میں پیش کرتی ہے ۔ اگر ہم سے پوچھا جائے تو ہم کہیں گے کہ اقبال کا ہر شعر ایک اہل نظر نقاد کے جامع الفاظ میں اپنے علم کی لطافت میں قرآن کی تفسیر اور اپنے عمل کی وسعتوں

عہ خود اقبال کہتے ہیں ۔ حق اگر سوزے ندارد حکمت ست ؛ شعر می گردد چو سوز از دل گرفت ؛

میں حدیث کے معنوں کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۸) ملک کے مشہور و معروف ادیب مولانا اسلم جیراجپوری یہ بلیغ اور وجد انگیز رائے رکھتے ہیں :-

" ذوقِ صحیح جذباتِ عالیہ کی اُن لطیف تحریکات پر وجد کرتا ہے جن سے دل کے تار بجتے ہیں یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر صاحب (اقبال) کی شاعری اہلِ فہم کی دماغی راحت اور روحانی لذت کے لئے ایک میوۂ پرمایہ ہوگئی ہے ۔ کیونکہ وہ علوم دینی و دنیوی و مشرقی و مغربی کے مجمع البحرین ہیں ذوقِ صحیح ' دلِ دردمند اور طلاقتِ لسانی رکھتے ہیں ۔ ان کی چشم بصیرت انسانی خیالات کی انتہائی بلندیوں پر پہنچی ہوئی ہے اور ان کے دیدۂ تخیل کے سامنے سے زمین سے آسمان تک کے پردے اُٹھے ہوئے ہیں ۔ وہ عرش کے پایوں میں جھولتے ہیں مرغانِ اولی اجنحہ کے ساتھ اُڑتے ہیں ۔ ساکنانِ حرم قدس سے ملتے ہیں ، بزمِ انجم و کواکب کے رموز سنتے ہیں شبنم اور آفتاب کے باہمی راز ، گل و بلبل کے ناز و نیاز اور پروانہ و شمع کے سوز و ساز سے آشنا ہیں ' پہاڑوں کی چٹانوں میں برق کی موجیں ، سمندروں کی موجوں میں زندگی کی لہریں ' قطرۂ اشک میں سوزشِ دل کا تب و تاب اور دانۂ گوہر میں حیاتِ معنوی کی آب دیکھتے ہیں ۔ غرض عالمستانِ معنی ہے جس کے چپے چپے اور گوشے گوشے سے جواہر پارے چنتے ہیں اور جذبات متجدد

دنیہ کا پیکر سستان تیار کرتے ہیں ان کی نگاہ اس قدر تیز بیں ہے کہ ایک ہی چیز پر نہیں رکتی بلکہ نتائج سے اسباب اور اسباب سے متعلقات پر بلندی سے پستی تک اور خشکی سے تری تک ایک ساتھ دوڑ جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا کلام اگرچہ تمام تر آورد ہے لیکن اس میں انتہائی لطافت اور انتہائی ایجاز ہے یعنی فصاحت لفظی اور بلاغت معنوی دونوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہے جو مضمون ہے وہ نہایت صاف، برجستہ اور نکتہ سنجی اور ندرتِ خیال کا پسندیدہ ترین نمونہ ہے۔ انداز بیان اور طرز ادا انوکھا اور دل کش ہے۔ ان کی توجہ خیالات کی رفعت اور معانی کی بلندی کی طرف زیادہ رہتی ہے۔ صنائع وبدائع وتشبیہات واستعارات کے پیچ میں وہ نہیں پڑتے لیکن باوجود اس کے لفظوں کی لطافت اور ترکیبوں کی نزاکت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیتے...... ان کا جام شاعری اُس سوگواری کی تلخی سے پاک ہے جو قومی مرثیہ گویوں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ وہ ماضی کے ماتمی نہیں ہیں بلکہ شاندار مستقبل کے مژدہ گو ہیں۔ ان کی شگفتہ طبیعت ایک بلبل ہے جو خزاں کی نوحہ خوانی نہیں کرتی بلکہ بہار کی آمد کا نغمہ گاتی ہے۔ وہ اپنی شاعری سے ملتِ جدیدہ کی دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لے رہے ہیں"۔

(۹) ہندوستان کے نامور مصوّر اور سخن فہم سردار اُمراؤ سنگھ بہادر

رقمطراز ہیں۔

"اقبال کی شاعری کی حقیقی قدر و منزلت کا تذکرہ گویا قدیم شاعری کی تضحیک ہے جو لوگ حسن کے صحیح ادراک پر قادر ہیں اور جن کے نزدیک پرمعنی الفاظ کی موسیقیت کچھ حقیقت رکھتی ہے اُن کی نظروں میں اقبال کا حسن کمال اتنا دلفریب ہے کہ وہ اس کے کلام کے مطالعہ کو بے لوث اور منزہ عشق کی لذت سمجھتے ہیں۔ اس کی نظمیں بڑے بڑے فارسی شعراکی نظموں کی ہم پلہ ہیں۔ علاوہ بریں خیالات کا یہی ذخیرہ گو دوسرے اُستادان فن کے یہاں بھی پایا جاتا ہے لیکن جدت و حسن بیان اقبال کے ہاں بڑھا ہوا ہے۔ اقبال کے پاس الفاظ کی بندش کے ساتھ بلند پروازی بھی ہے جو مشکل سے اُن کے پیش روؤں میں پائی جائے گی اقبال نے اپنی طویل نظموں میں جو تعمیری خیال پیش کیا ہے وہ حق بجانب کوشش ہے کہ مذہب میں روحانیت کی اشاعت قبل از وقت نہ ہونی چاہئے جس سے بظاہر رواداری تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن حقیقت میں فرائض کے انجام نہ دینے کے لئے وہ ایک ایسا سہارا ہو جاتا ہے کہ مذہب کی روح رواں کو فنا کر دیتا ہے جتنا صلح جو اتنی بات ہونی چاہئے ورنہ لوگ ایسی باتوں کا اعتراف اور اقرار کرتے ہیں جن کو وہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انجام کار یہ ہوتا ہے کہ غلط فہمیوں اور الجھنوں سے صاف و شفاف مذہب کا چشمہ گدلا ہو جاتا ہے اور ایک زندہ اور سچے دین کی خصوصیات ملیا میٹ ہو جاتی

ہیں غرض جس اجتماعی نظام کو صرف مذہبی جذبات قائم رکھ سکتے اور ترقی دے سکتے ہیں اس کے لئے روحانیت کی اندھا دھند بے موقع اشاعت و تبلیغ سم قاتل ہے۔ اس پہلو سے اقبال کا کلام بھگوت گیتا سے کم نہیں جس کا لب لباب یہ ہے کہ جماعتِ انسانی کی بقا اور ترقی کے لئے اُس مذہبی فلسفہ سے کام لینا چاہئے جس سے علیحدہ ہوکر اور جس کو نظر انداز کرکے سوسائٹی بکھر برباد و تباہ ہو جاتی ہے اور اسی میں برہمنوں کی اصلاح کا راز مضمر مانا گیا تھا شاعر کی دوربین نظروں نے پہلے ہی سے اس ابتری اور زوال کو دیکھ لیا تھا جو یورپ کی مادہ پرستی دنیا کے لئے پیدا کرنے والی تھی جس کو شروع شروع میں ترقی و تمدن کا نقیب سمجھا گیا تھا ایک طرف تو شاعر کی سعی یہ ہے کہ غیر معین تصوف کے نقص کو دور کرے اور دوسری طرف یہ کہ اس سے بھی زبوں تر مادیت کی تباہ کرنے والی خاصیت کو شکست دے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے (اور میں تو اسی پہلو سے دیکھتا ہوں) تو معلوم ہوگا کہ یہ نظمیں عالمگیر ہیں اگرچہ ان میں بظاہر صرف اسلامی دنیا ہی سے خطاب کیا گیا ہے۔

جب میں اقبال کے روبرو اسی قسم کے نظموں میں سے ایک نظم پڑھ رہا تھا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ تعمیری خیالات کی کس قدر بہتات ہے اور کیا ہی پاکیزہ اور شستہ خیالات ہیں جو سطحی نظر میں محض اس وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے کہ ذہن میں الفاظ کے

پرانے معنی جمے ہوئے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم دونوں زبانوں میں دیکھتے ہیں۔ اس کے
کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ الفاظ سے نئے نئے معنی اس طرح پیدا کئے گئے ہیں جس
طرح کہ ایف. ڈبلیو بین کے کلام میں پایا جاتا ہے کہ ان سے انگریزی کے لفظ اور
جملوں میں ایسی لچک اور ایسے خیالات کی گنجائش موجود ہے کہ ہندوستان نے ان سے
اپنے رنگ کے ایسے مطالب و معانی نکالے جن سے وہ دراصل بالکل عاری تھے بالکل
اسی انداز سے اقبال بھی فارسی اور اردو زبانوں سے کام لے رہا ہے۔

اقبال کے کلام میں حافظ و رومی کی خصوصیات بھی نمایاں ہیں۔ اگرچہ طویل نظموں
کے سنجیدہ حصوں میں مخصوص انداز اس سطح پر قائم نہیں رہتا جیسا کہ مختصر نظموں
تاہم اقبال میں ایک رومی کا جلوہ نظر آتا ہے جو طبیعت کی شستگی سے تعلق رکھتی ہے اور
جس میں خیالات کے ساتھ جاذبیت بھی ہے۔

اکثر اپنے دوست سر ذوالفقار کے مکان پر میں نے اقبال کو ایسی خوشگوار اور
دلکش فضا میں لپٹے ہوئے دیکھا ہے جس کے محسوس کرنے کے لئے تخیل کی ضرورت
نہیں۔ ایسے اوقات میں ان کے نغمہ ہائے شیریں کے شروع ہونے سے پہلے
گفتگو خود بخود نغمہ بن جایا کرتی تھی۔ ممکن ہے کہ بعض ایسے لوگ بھی ہوں جو ان کے
ترانوں سے وجد میں نہ آتے ہوں۔ لیکن میرے خیال میں کوئی ایسا فرد بشر ہوگا

یہاں تو یہ کیفیت ہوتی تھی کہ عالم بالا کی خالص اور چھلکتی ہوئی شراب طہور کا مزہ آتا تھا
اور پیاپے جام کی طلب ہوتی تھی۔"

(۱۰) مولانا ظفر علی خانصاحب نے جنگ طرابلس کے زمانہ میں لکھا تھا:-

"گروہ علما و شعرا میں وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو اپنے اقوال کے ذریعہ سے اہلِ زمانہ
کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں عالم، ناصح
فلاسفر بھی ہمیشہ جچی تلی بات کہتے ہیں مگر اس کا اثر جلدی نہیں ہوتا اور اس کی
وجہ یہ ہے کہ ان کی نظر وسیع ہوتی ہے۔ وہ آج کے پیش آمدہ واقعہ سے کل کے
نتیجہ کی طرف غور کرنے کے خوگر ہوتے ہیں۔ اثر ان کے قول کا بھی ہوتا ہے اور ضرور
ہوتا ہے اور ایک عرصۂ دراز تک قائم رہتا ہے مگر شاعر اپنی زبان سے جو کچھ
کہتا ہے اگر اُس میں اثر کی قوت مضمر ہو تو دنیا میں آگ لگ سکتی ہے اور بندوق
کی گولی کی طرح نشانہ فوراً اڑ جاتا ہے۔ عربی رجز خوانی چشم زدن میں ہزارہا بندگان
خدا کے گلے کٹوا دیا کرتی تھی اور آج طرابلس میں بھی اسی رجز خوانی یا شاعری کی بدولت
عربوں میں وہ جوش و خروش پیدا ہو گیا ہے کہ اپنے سے کئی گنا فوج پر ہر معرکہ میں مظفر
و منصور رہتے ہیں مگر دوسرے لوگوں پر کلام کے ذریعہ سے اثر ڈالنا ہر شخص کا کام نہیں
اس میں وہی شاعر کامیابی حاصل کر سکتا ہے جو زمانہ کی رفتار پر نظر رکھے اور اُس کے مطابق

ہیں توسن فکر کو ... جولاں کرتے۔ اس قسم کے زباں شناس شاعروں میں ہمارے
[illegible] دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایک پایۂ خاص رکھتے ہیں۔ ان سے پیشتر جذبات
حسن و عشق کی ترجمانی کا حق داغ مرحوم کمال خوبی و خوش اسلوبی سے ادا کر گئے ہیں
[illegible] ان کی زبان سے وہی بات نکلتی تھی جو عاشق مزاجوں کے دل میں ہوتی تھی۔ ڈاکٹر
اقبال نے داغ کی تعریف میں بالکل ٹھیک کہا ہے ع تھی زبان داغ پر جو آرزو
ہر دل میں ہے۔ مگر اقبال کی شاعری داغ کی شاعری سے مختلف ہے۔ داغ مرحوم
حسن و عشق کے نغمہ زیب گلشن میں گل چینی کرتے تھے تو ڈاکٹر اقبال انسان کے پاک
[illegible] قومی و مذہبی چمنستان کی سیر میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے کلام کے ذریعے
اس کے نقش و نگار سامعین و ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ [illegible] عقل دنگ رہ جاتی
ہے۔ ڈاکٹر نکلسن معلم کیمبرج یونیورسٹی لکھتے ہیں:-
ڈاکٹر اقبال کا پیغام صرف مسلمانان ہند کے لئے مخصوص نہیں بلکہ وہ تمام عالم اسلامی کے لئے ہے۔ اس کا فلسفہ

۱؎ تاریخ علم و حکمت انسانی کا وہ سب سے بڑا شخص جس کے آگے یونانیوں کا پیدا اور علم اور یورپ
کی [illegible] ذہنیت [illegible] ہوگئی۔ اس عجیب و غریب حکیم نے دنیا کی پوری کائنات علم و فلسفہ کو یک سر
منقلب کر دیا اور جن اصولوں کو آج تک تمام ممالک متمدنہ اپنے ارتقائے علمی کا آخری مرتبہ
سمجھتے تھے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ ادنیٰ ترین مرتبۂ وہم و ضلالت ہے۔ Neit 8che
نیٹشے جرمنی کا باشندہ تھا (آزاد)

اور برگساں[1] BURGSON کا ممنونِ احسان ہے اور اس کی شاعری ہمارے دل میں شیلی[2] Shelly کی یاد تازہ کرتی ہے۔ لیکن اس پر بھی اس کا ہر خیال اور اس کا ہر قول ایک مسلمان کا خیال اور مسلمان کا قول ہوتا ہے اور شاید اسی وجہ سے اس کا اثر زیادہ ہو۔ وہ ایک پرجوش مذہبی مسلمان ہے وہ ایک نئے مکہ (معظمہ) کا خواب دیکھتا ہے اسے ایک وسیع جمہوری دنیا نظر آتی ہے جس میں تمام اسلامی ریاستیں متحد و مشترک ہیں جس میں ملک وملت کی کوئی تمیز نہیں اسے قومیت وشہنشاہیت کی ضرورت نہیں۔ اس کے خیال میں تو یہ چیزیں انسان کو جنت سے محروم کر دیتی ہیں، ایک دوسرے سے ناآشنا ہو جاتا ہے، برادرانہ جذبات مفقود ہو جاتے ہیں اور جنگ کا تلخ تخم بویا جاتا ہے، وہ سیاست کی جگہ مذہبی حکومت کا خواب دیکھتا ہے اور "مشیاولی" کو جو جھوٹے دیوتاؤں کی پرستش کرتا ہے اور جس نے بہتوں کو اندھا، گمراہ کر رکھا ہے بُرا بھلا کہتا ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ جب کبھی مذہب کا نام لیتا ہے تو اُس سے اُس کی مراد

---

[1] فرانس کا وہ مشہور عالم فلسفی جس کی تصنیفات "ارتقائے زندگی" پر یورپ اور امریکہ میں آج کل بہت مقبول ہیں (مرتب)

[2] ہماری دانست میں اقبال پر ان دونوں سے زیادہ علامہ شبلی کا اثر ہے۔ خصوصیات شاعری کے عنوان کے تحت اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائی جائے۔ (مرتب)

صرف مذہب اسلام ہے جو غیر مسود کی معنی خدا کا منکر ہے۔ اور ایک حد تک اس پر جہاد
کرنا لازم ہے بشرطیکہ وہ محض لوجہ اللہ ہو۔ ایک آزاد مخلص اسلامی برادری جس کا
مرکز کعبہ ہو اور جو رشتہ حب اللہ والرسول سے بندھی ہوئی ہو اقبال کا نقطۂ نظر ہے
مولانا جلال الدین رومی کی طرح اقبال بھی اپنے مطالب کو زود فہم اور آسان بنانے
کے لئے جابجا حکایات وامثال سے کام لیتا ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسری
صورت نہیں۔

اب یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کس طرف کا رخ کرتی ہے۔ کیا یہ لوگ
ایک دور دراز مدینۃ اللہ کا خواب دیکھ کر خوش ہو جائیں گے یا ان اصولوں کو وہ اس کے
مصنف کے خیال کے برخلاف کسی دوسری غرض کے حصول کے لئے استعمال کریں گے
باوجودیکہ وہ واضح طور سے علانیہ قومیت پرستی (نیشنلزم) کی مذمت کرتا ہے تاہم
اس کے معتقدین کا خیال ہے کہ اس سے اس کی کوئی دوسری مراد ہے۔ (معارف)

(۱۲) مولانا عبداللہ عمادی رقم فرماتے ہیں کہ۔

"ہندوستان میں جس وقت بیداری کے دوسرے معنی خواب غفلت تھے، جب اسلامی
جذبات کے مضحکے اڑائے جاتے تھے، جب قومیت کا احساس موجود ہی نہ تھا، اس وقت
سب سے پہلے اسلام کے جس فرد کامل نے اعلائے کلمۃ اللہ کا دائرہ بلند کیا اور اس

صور اسرافیل کو تا بہ فلک پہنچا دیا وہ ڈاکٹر اقبال کی اور صرف ڈاکٹر اقبال کی پاک ہستی تھی جو حقیقت میں تحریک حریت اسلامی کی من حیث الشرع والدین اولین محرک ہے۔ اکبر، آزاد، ظفر، محمد، شوکت، سب اسی خرمن کے خوشہ چین ہیں اور سب کے دلوں میں اسی کی تعلیمات صدق و صفا سے گرمی پیدا ہوئی ہے۔"

(۴)

مذکورۂ بالا اقسام کی بیسیوں تعریفیں دیگر ماہرانِ فن نے کی ہیں جن کے اندراج کی یہاں گنجائش نہیں صرف چند نظمیں[۲] درج کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ ہم عصر شاعروں کی نظروں میں اقبال کا کیا رتبہ ہے۔

اے ز نغم ہائے رنگینت گلستانِ سخن[۱] ۔۔۔ معنیٔ عیسیٰ دمت بخشندۂ جانِ سخن

اے حیاتِ تازہ داری نغمہ را از نطقِ خویش ۔۔۔ گشتۂ شور افگن ارض و سما از نطقِ خویش

اے عروسِ طبعِ برما جلوہ ہا پاشیدۂ ۔۔۔ وز چمن زارِ تکلم تازہ گل ہا چیدۂ

شعلہ سوز اندوز از آتش نوائی ہائے تو ۔۔۔ بادہ کیف آموز از تخئیل ذوق افزائے تو

---

[۱] جس شاعر نے نظم لکھی ہے اس کا تخلص نظم کے آخر میں درج کیا گیا ہے۔

[۲] ہم نے دیباچہ میں چند نظمیں فارسی کی درج کی ہیں اس پر ان لوگوں کو اعتراض ہوگا جو اردو کو ہندیت کے سمندر میں غرق کرنا چاہتے ہیں لیکن ہم اردو کو فارسی سے الگ نہیں سمجھتے کہ ان دونوں میں جسم و روح کا تعلق ہے

بر فراز طارمِ اعلیٰ لوا افراختی ۔۔۔ نرد خود را در قمارِ جمع ما در باختی

یافت از تو مرکزے ہنگامۂ بیتاب ما

ریختی تخمِ سکوں در مزرعِ سیماب ما ۔۔۔ (عرشی امرتسری)

عرض کر حضرتِ اقبال سے جا کر یہ صبا ۲ ۔۔۔ اے کہ دنیائے سخن میں تری تمثال نہیں

ماجرا کیا ہے کہ خاموش ہے کچھ روز سے تو ۔۔۔ گرمِ پرواز ترا فکرِ سبک بال نہیں

بزم کہتی ہے کہ تو جب سے نہیں زمزمہ سنج

کسی آہنگ میں وہ سُر نہیں وہ تال نہیں ۔۔۔ (مسلم)

جستجوئے پیہم باد صبا آموختی ۲ ۔۔۔ یا دلِ بے مدعا را مدعا آموختی

روشناسِ خندہ کردی غنچۂ پژمردہ را ۔۔۔ بلبلِ خاموش را عشق نوا آموختی

حسن را آگاہ کردی از بہائے جنسِ خویش ۔۔۔ سادہ را عشوہ و ناز و ادا آموختی

قطرۂ شبنم ز فیضت پارۂ الماس شد ۔۔۔ فانی را سرِّ قانونِ بقا آموختی

قائلِ اعجازِ تو شد واعظ پیرِ مغاں ۔۔۔ مسلم کافر منش را یا خدا آموختی

خواجۂ مغرور را آگاہ کردی از جفا ۔۔۔ بندۂ مزدور را ردِّ بلا آموختی

زندہ باد اے شمعِ مہر افروزِ مشرق زندہ باد

ہمچو قرآں نقشِ کلکت تازہ و پائندہ باد ۔۔۔ (امین)

ہمنوائے بلبلِ غم دیدۂ شاخِ کہن ۴ رازدارِ سوزشِ شمعِ شبستانِ سخن

محو یادِ رفتگاں وقفِ ستم ہائے فراق　　مست جامِ بادۂ خونابِ غم ہائے فراق

امتِ مرحومہ کے غم کا خزانہ دل ترا　　تیر یادِ بزمِ یثرب کا نشانہ دل ترا

خواب ہائے عاشقِ بیتاب کی تعبیر تو　　دردِ اسلامی کی جیتی جاگتی تصویر تو

تیری ہر اک بات تفسیرِ کتابِ عشق ہے　　تیری شمشیرِ سخن کی تاب آبِ عشق ہے

شعر تیرا ہمت ہر دو جہاں پر خندہ زن　　گنبدِ افلاک ہے نالوں سے تیرے نعرہ زن

تیری ہی طرزِ بیاں ہے رنگِ صہبائے سخن　　تیری ہستی ضامنِ ہستیٔ دنیائے سخن

وارثِ گنجینۂ پارینۂ دہلی ہے تو　　یادگارِ غالبِ مرحوم دہلی ہے تو

قلبِ مسلم میں تو اپنی شانِ عظمت دیکھ لے　　خاتم دل کے نگیں میں اپنی صورت دیکھ لے

نور از حسنِ خود افگن برخ شرقِ سخن

خرمنِ باطل بسوز از آتشِ برقِ سخن　　(حکیم احمد شجاع)

۱۔ اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبعِ نور ۵ ہر حرف سے ہے تجلیٔ حق کا ظہور

اوجِ ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ　　ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور

۲۔ خیر ماضی نہ سہی حال کی نظمیں دیکھو　　حضرتِ اکبر و اقبال کی نظمیں دیکھو

اِن کو کس سحر سے مضمون کے دُر ملتے ہیں　　وہ ترانے ہیں کہ افلاک سے سُر ملتے ہیں

(لسان العصر اکبر الہ آبادی)

اٹھا دہ جھوم کے ساقی چمن میں ابرِ بہار ؎ چٹک رہے ہیں شگوفے برس رہی ہے پھوار
کلی کلی نے نکالا ہے روپ یوں جیسے کسی کے سینہ پہ گدرِ شباب کا ہو ابھار
ہے موتیوں کی لڑی یا قطار جگنوں کی ہوا میں اڑتے ہیں جگنو کہ چھوٹتے ہیں انار
پلا شراب کہ ہیں مغتنم یہ دن ساقی کہاں یہ سبزہ و گل پھر کہاں یہ صحبتِ یار

بہار آئی شگفتہ ہوئے گلِ پنجاب
چہک چہک کہ کدھر ہے تو بلبلِ پنجاب

ترانہ لبِ شیریں ادا کے دن آئے غزل سرا ہو کہ تیری صدا کے دن آئے
عروسِ نظم نے کاجل لگایا آنکھوں میں فسون و عشوہ و ناز و ادا کے دن آئے
ادھر بھی کوئی ایاغ مئے سخن ساقی اٹھے وہ جھوم کے بادل گھٹا کے دن آئے
ترانہ سنج ہو او بلبلِ ریاضِ سخن کہاں ہے تو کہ چمن میں غنا کے دن آئے

ترے بغیر ہیں مرغانِ نغمہ زن خاموش
ترے بغیر ہے یاروں کی انجمن خاموش (سرور جہان آبادی)

۱۔ در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال ؎ پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت
۲۔ درس ماسی از کتاب حال گیر ساغر از خمخانۂ اقبال گیر
حضرتِ اقبال آں بالغ نظر داردا زبود و نبود ما خبر

سے یعنی اقبال

ما بہ ذوقِ سوختن کم ساختیم | بیخودی را از خودی نشناختیم
آں نوا پرداز اسرارِ ازل | شہسوارِ عرصۂ علم و عمل
بیخودی را در خودی منزل شناس | در غبارِ کارواں محمل شناس
از نوایش بزمِ یورپ در خروش | حکمت امریکہ او را اسفنہ گوش
نالہ ہائے آتشینِ آں حکیم | سوخت رختِ فتنۂ اُمید و بیم

ساخت با دلہا و بودش ہیچ نیست
سوخت دل ہا را و دودش ہیچ نیست (گرامی)

۳- جامِ جم گیر کہ در میکدہ خوش گفت اقبال | "قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا"

تیرے نالوں نے کیا پیدا عجب جوش و خروش | قلزمِ اسلام کا ہر قطرہ ہے طوفاں بدوش
گر خودی[۱] سے تیری حاصل ہو دیار روشن و جبیں | بیخودی[۲] تیری ہو وجہ شوکتِ دینِ مبیں
نطق میں تیرے پیامِ عزتِ اسلام ہے | تیری حکمت سے بقا ساماں ہمارا نام ہے

جسمِ حکمت میں مثالِ دیدۂ بینا ہے تو
یادگارِ ابنِ رشد و بوعلی سینا ہے تو (راشد)

---

۱ اسرار خودی ۲ رموز بیخودی -

۵

خصوصیات شاعری

اب ہم اقبال کی شاعری کی بعض خصوصیات بیان کرتے ہیں۔

(۱) الف۔ اقبال کے کلام میں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں ہے وہ اسلامیت کی روح ہے متعدد جگہ وہ اپنا مافی الضمیر کھول کھول کر بیان کرتے ہیں کہ اسلام میں زندگی کا مقصد بہت اعلیٰ وارفع ہے اور مسلمانوں کی زندگی کا راز ان کے مذہب اور ان کی عالمگیر اخوت میں مضمر ہے۔ مسلمانوں کو تمام مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ وہ کائناتِ عالم کی روح رواں ہیں۔ ان کو رنگ و نسب کا امتیاز اٹھا دینا چاہئے اور خلفائے راشدین اور دیگر اسلاف کے صفاتِ حسنہ پیدا کرنے چاہئیں تاکہ وہ اپنی ان خصوصیتوں کی بنا پر دنیا کی رہبری کر سکیں چنانچہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے ۔۔۔ یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی ۔۔۔ ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا ۔۔۔ خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی ۔۔۔ جہاں کے جوہرِ مضموں کا گویا امتحاں تو ہے

جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

(ب) اسی قسم کے خیالات اقبال نے فارسی مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں اور متنظر ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کی جماعت کو جو پیام دیا ہے اس کا اثر عملی شکل میں نمودار ہو اور اسلام کا بول بالا ہو اس لئے وہ اسلامی قوتوں سے مخاطب ہوتے ہیں مثلاً شاہِ دکن اعلیحضرت حضور نظام آصف جاہِ سابع نواب میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ میں ایک یادگار اسلامی طاقت اور گوناگوں اوصافِ حمیدہ دیکھتے ہیں تو یہ نظم لکھتے ہیں۔

خطاب بہ تاجدارِ دکن

اے مقامت برتر از چرخِ بریں از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں

جلوۂ صدیق از سیمائے تو حافظِ ما تیغ جوشن خائے تو

از تو ما را صبح خنداں شام ہند | آستانت مرکز اسلام ہند

دوش ملت زندہ از امروز تو | تاب ایں برق کہن از سوز تو

بندگان ستیم ما تو خواجہ | از پئے فردائے ما دیباچہ

گوہر م را شوخیش بے باک کرد | تا گریبان صدف را چاک کرد

پیش سلطاں ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خون جگر آوردہ ام

اس کے ہر شعر ہر مصرع پر طویل طویل مضامین لکھے جا سکتے ہیں ۔
از تو ما را صبح خنداں شام ہند ؛ حافظ ما تیغ جوشن خائے تو ؛ از پئے فردائے ما دیباچہ
آستانت مرکز اسلام ہند ؛ ان مصرعوں کی بلاغت اہل معنی سے مخفی نہیں ہے
یہ نظم لکھ کر اقبال نے ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی
کی ہے اور حق یہ ہے کہ حق ترجمانی ادا کر دیا ہے ۔

آج عالم اسلامی میں ہر طرف جو بیداری نظر آ رہی ہے عجب نہیں کہ اقبال
کی یہ دعا قبول ہوئی ہو ۔

---

[1] اقبال نے اس نظم کے ساتھ فارسی کی مثنوی "رموز بیخودی" کا ایک نسخہ بھی اعلیٰحضرت بندگان عالی کی
خدمت اقدس میں بطور ہدیہ مختصر ارسال کیا تھا جسے شرف قبول حاصل ہوا ۔

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے　　جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرہ کو چمکا دے　　پھر شوق تماشا دے پھر ذوق تقاضا دے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر

خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے

(۲) دوسری سب سے بڑی خصوصیت جو اقبال کو تمام ایشیائی شاعروں سے الگ کر دیتی ہے وہ ان کا عجمیت کے خلاف جہاد ہے۔ اس عجمیت کی نسبت وہ خود کیا کہتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

ایک دفعہ ان کے پاس ایک نظم بغرض اصلاح آئی تھی جس کا مطلع یہ تھا

میری حیات وجہ عرفان زندگی ہے

یعنی کہ زندگی پر احسانِ زندگی ہے

اس کو انھوں نے یوں بدل دیا۔

کہتے ہیں مرگ جس کو عرفانِ زندگی ہے

یعنی کہ موت پر بھی احسان زندگی ہے

اور اس خط کے ساتھ نظم واپس کر دی۔

" زمانہ حال میں "عجمیت" سے اجتناب لازم ہے اس وقت ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جو قوت

خدائے تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے اسلام کی خدمت اور اتحادِ ملتِ اسلامیہ کی تائید میں صرف کرے۔ میری رائے میں "عجمیت"[1] ایشیا کے مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی ہے اس وقت باطل کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض تھا۔ عجمیت کا اثر مذہب، لٹریچر اور تمام زندگی پر غالب ہے۔ شاید عربوں اور افغانوں کے سوا تمام اقوام اسلامیہ اس زہر سے خطرناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں شعرائے عرب سے میری مراد شعرائے زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ بنو امیہ ہیں۔ عباسیوں کے عہد میں عجمیت عرب کے لٹریچر پر غالب آ گئی تھی۔ اس زمانہ کی شاعری کا مطالعہ کچھ مفید نہیں خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو اپنی آئیڈیل کی تلاش میں ہوں۔"

(۳) کلام اقبال کی تیسری سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کسی کی مدح سرائی یا قصیدہ خوانی سے قطعاً بری ہے ابتدائی زمانہ سے لے کر آج تک اقبال نے ستائشی یا فرمائشی نظمیں نہیں لکھیں۔ یہ صفت ان کو دوسرے شعراء پر بہت ممتاز کرتی ہے کہ مشرق میں جتنے نامور شاعر ہوئے ہیں ان میں مشکل سے کوئی ایسا نکلے گا جس کا دامن قصیدہ گوئی سے پاک رہا ہو۔ ان قصیدہ گویوں نے

---

[1] یہ وہی عجمیت ہے جس کی نسبت اکبر نے کہا تھا۔ شعر: ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ (مرتب)

شاعری کی ماہیت ہی نہ سمجھی اور اس کو کسب زر، حصول جاہ، قرب سلطان اور اسی قسم کے دوسرے ذاتی اغراض کے تابع کر دیا۔ برخلاف اس کے اقبال "شاعری جزویست از پیغمبری" کی حقیقت سے واقف ہیں ان کو کسب زر کی خواہش ہے نہ حصول جاہ کی پروا۔ وہ امیروں کی مدح نہیں کرتے ع مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار۔ بلکہ شاعری سے روح کو بیدار کرتے ہیں اور ایک پیغمبر کی مانند ملک و ملت کو روحانیت کی جانب لے جاتے ہیں۔

(۴) اقبال کے کلام کا بغور مطالعہ کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک شعر کی دیبی نغمہ خواں ہے۔ میر کا سوز و گداز، غالب کی جدت و اجتہاد، مومن کی نازک خیالی، ذوق کی روانی و صفائی، درد کی تاثیر و دلاویزی، شکسپیر کی فطرت نگاری، ملٹن کی پرواز فکر، شیلی کی شیریں کلامی، ورڈس ورتھ کی نیچر پرستی، ٹینسن کی فصاحت، کولرج کی موسیقی، کوپر کی تخئیل اور گیٹے کی حکمت شعاری یہ سب اُن کے کلام میں جمع ہیں۔ یہ اُن کے کمال فن کی دلیل ہے کہ وہ با ہمہ اور بے ہمہ ہیں یعنی وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے تاہم دوسرے اساتذۂ فن کے رنگ میں شعر کہنے پر ایسی ہی قدرت رکھتے ہیں جیسی اپنے طرز کلام پر۔ اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حالی کے بعد تین

بجز اس کے کہ دونوں قومی شاعر ہیں حالی اور اقبال کے طرز بیان میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ اقبال کی شان اس سمندر کی سی ہے جو موجیں مار رہا ہو اور جس کی رفتار سامنے کی ہر شے کو بہائے لئے جاتی ہو۔ اور حالی وہ دریا ہے جس کا پانی نہایت آہستہ بہہ رہا ہو۔ باوجود اس فرق کے حالی کی سلیس زبان میں اقبال کی نظمیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) ہمدردی

ٹہنی پہ کسی شجر کے تنہا — بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی — اڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک — ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری — جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے — کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل — چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

(۲) ایک مکڑا اور مکھی

اک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا — اس راہ سے ہوتا ہے گذر روز تمہارا
لیکن مری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت — بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا
غیروں سے نہ ملئے تو کوئی بات نہیں ہے — اپنوں سے مگر چاہئے یوں کھنچ کے نہ رہنا
آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری — وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا
مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی — حضرت! کسی نادان کو دیجے گا یہ دھوکا

اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا۔ پھر نہیں اترا

مکڑے نے کہا۔ واہ فریبی مجھے سمجھے — تم سا کوئی نادان زمانے میں نہ ہوگا
منظور تمہاری مجھے خاطر تھی۔ وگرنہ — کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا
اڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے — ٹھیرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں برا کیا!
اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں — باہر سے نظر آتا ہے چھوٹی سی یہ کٹیا
لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے — دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے — ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا
مکھی نے کہا۔ خیر! یہ سب ٹھیک ہے لیکن — میں آپ کے گھر آؤں۔ یہ امید نہ رکھنا

ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا!

مکڑے نے کہا دل میں سنی بات جو اس کی	پھانسوں اسے کس طرح یہ کم بخت ہے دانا
سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں	دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا
یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے بڑی بی!	اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رتبا!
ہوتی ہے اسے آپ کی صورت سے محبت	ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں	سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا
یہ حسن یہ پوشاک یہ خوبی یہ صفائی	پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا
مکھی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیجی	بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا
یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے	پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا

بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اڑایا

(۳) ماں اور بچہ

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب	بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں	اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں

لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال — قدم کا تھا دہشت سے اُٹھنا محال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی — تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
زمرّد سے پوشاک پہنے ہوئے — دیئے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
وہ چُپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں — خدا جانے جانا تھا ان کو کہاں!
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر — مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا — دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں! — مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟
جدائی میں رہتی ہوں میں بیقرار — پُروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی — گئے چھوڑ اچھی وفا تم نے کی!
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب — دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب
رُلاتی ہے تجھ کو جدائی مری — نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
یہ کہکر وہ کچھ دیر تک چپ رہا — دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا

سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے!

(۴) ایک گائے اور بکری

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں — تھی سراپا بہار جس کی زمیں

کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں — ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں

تھے اناروں کے بے شمار درخت — اور پیپل کے سایہ دار درخت

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں — طائروں کی صدائیں آتی تھیں

کسی ندی کے پاس اک بکری — چرتے چرتے کہیں سے آ نکلی

جب ٹھہر کر اُدھر اُدھر دیکھا — پاس اک گائے کو کھڑے پایا

پہلے جھک کر اُسے سلام کیا — پھر سلیقے سے یوں کلام کیا

کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں؟ — گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں

کٹ رہی ہے بُری بھلی اپنی — ہے مصیبت میں زندگی اپنی

جان پر آ بنی ہے۔ کیا کہیے؟ — اپنی قسمت بُری ہے۔ کیا کہیے؟

دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں — رو رہی ہوں بُروں کی جان کو میں

زور چلتا نہیں غریبوں کا — پیش آیا لکھا نصیبوں کا

آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے — اس سے پالا پڑے خدا نہ کرے

دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے — ہوں جو دُبلی تو بیچ کھاتا ہے

ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے | کن فریبوں سے رام کرتا ہے!

اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں | دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں

بدلے نیکی کے یہ برائی ہے | میرے اللہ! تری دُہائی ہے!!

سُن کے بکری یہ ماجرا سارا | بُولی ایسا گلہ نہیں اچھا

بات سچّی ہے بے مزا لگتی | میں کہوں گی مگر خدا لگتی

یہ چراگہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا | یہ ہری گھاس اور یہ سایا

ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں | یہ کہاں بے زباں غریب کہاں

یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں | لطف سارے اسی کے دم سے ہیں

اس کے دم سے ہے اپنی آبادی | قید ہم کو بھلی کہ آزادی ؟

سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا | واں کی گذران سے بچائے خدا

ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا | ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا

قدر آرام کی اگر سمجھو | آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو

گائے سُن کر یہ بات شرمائی | آدمی کے گلے سے پچھتائی

دل میں پرکھا بھلا بُرا اس نے | اور کچھ سوچ کر کہا اس نے

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی | دل کو لگتی ہے بات بکری کی!

غالب کے رنگ میں | ذیل کے ہم طرح اشعار

(غالب) شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب — نقشِ ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا

(اقبال) حلقۂ زنجیر کا ہر جوہر پنہاں نکلا — آئینہ قیس کی تصویر کا زنداں نکلا
وسعت افزائی آشفتگیِ شوق نہ پوچھ — خاک کی مٹھی میں پوشیدہ بیاباں نکلا
ہم گراں جان کے لائے تھے عدم سے بلبل — باغ ہستی میں متاعِ نفس ارزاں نکلا

ان میں غالب کا دوسرا شعر غیر مطبوعہ ہے اور حال ہی میں نسخۂ حمیدیہ میں چھپا ہے۔
اقبال کا دوسرا شعر ۱۹۰۱ء میں کہا گیا ہے دونوں اشعار ایک دوسرے کے مطابق ہیں
اقبال کے پہلے دو شعر اگر غالب کے دیوان میں رکھ دیئے جائیں تو خاص خاص اساتذہ
کے سوا مشکل سے لوگ یہ تمیز کریں گے کہ یہ غالب کا کلام نہیں ہے۔

امیر کے رنگ میں | ذیل کے اشعار پڑھنے سے امیر مینائی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

فنا ہوئے پہ بھی گویا وفا شعار ہوں میں — جو مٹ گیا تو حسینوں کا اعتبار ہوں میں
نشہ میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ — وہ اپنا وعظ کہے جائے ہوشیار ہوں میں
تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ — کہا جو سر کو جھکا کر گناہ گار ہوں میں

داغ کے رنگ میں | یہ شعر ملاحظہ ہوں داغ کو بھی رشک ہونا چاہیے کہ اس کے شاگرد نے ایسے شعر نکالے ہیں

محفل ہو شغل مے ہو شب ماہتاب ہو — اور میں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی
سو سو امید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر — مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی
دے کر جھلک سی آپ تو پردے میں ہو رہے — اور کہہ گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی

| شبلی کے رنگ میں | یہہ نظم ملاحظہ ہو ۔

ایثار صدّیق

اک دن رسول پاک نے اصحاب سے کہا — دیں مال راہ حق میں جو ہوں تم میں مالدار
ارشاد سن کے فرط طرب سے عمرؓ اُٹھے — اُس روز اُن کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیق سے ضرور — بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار
لائے غرض کہ مال رسولِ خدا کے پاس — ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار
پوچھا حضور سرورِ عالم نے اے عمرؓ! — اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟ — مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار
کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق — باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار
اتنے میں وہ رفیقِ نبوّت بھی آگیا — شاہد ہے جس کی مہر و وفا پر حرا کی غار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت — ہر چیز جس سے چشم جہاں میں ہو اعتبار
ملک یمین و درہم و دینار و رخت و جنس — اسپ قمر سم و شتر و قاطر و حمار

بولے حضور چاہئے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

پروانوں کو چراغ عنادل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس!

(۵) ڈاکٹر اقبال کی تشبیہات استعارات سخن سنج طبقے کو وجد میں لاتے ہیں۔

(۱) ماہِ نو کی نسبت کہتے ہیں۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھول ہے فصدِ آفتاب

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

چاند سورج سے کسبِ نور کرتا ہے اس لئے اس کو سورج کا ٹکڑا یا سورج کا خوان کہنا حقیقت سے کس قدر قریب ہے۔

(۲) ہلالِ عید کے متعلق لکھتے ہیں۔

یہ ابھرتے ہی آنکھ سے چھپنا
روشنی کا مگر حجاب ہے تو

ہلالِ عید کو اس وجہ سے کہ نظر سے جلد غائب ہو جاتا ہے روشنی کا حجاب کہنا ایک خاص مناسبت رکھتا ہے۔ ہر شاعر کی نظر ایسے نکات پر نہیں پڑتی

(۳) اسی طرح جگنو کو انجمن گل کی شمع، شفق کو سورج کے پھول، صبح کو دختر لیل و نہار، حیات کو تسلسل فرائض، غم کو روح کا نغمۂ خاموش، زندگی کو خس آتش سوار، گل کو پیمان رنگ و بو، ہلال کو حلقۂ پر طاؤس ...... کہنے میں کسقدر لطافت ہے۔

ب۔ اقبال کے دلی جذبات اور اصلی مطالب ظاہری الفاظ میں پوشیدہ ہیں وہ سچ کہتے ہیں ع چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعاروں میں ایسا کرنے پر وہ مجبور رہیں۔ وہ اُس زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں جب اسلامی حکومت کا سایہ سر سے اُٹھ چکا ہے، چاروں طرف مخالف اثرات کام کر رہے ہیں اس کے برعکس انگلستان میں شیکسپیر، جرمنی میں گوئٹے اور انگورہ میں ضیا یہ سب شاعر اپنے اپنے ملک میں تھے اور اُن پر اُن کی اپنی قوم کے افراد حکمران تھے، اظہار خیالات کی اظہار جذبات کی، ہر طرح کی آزادی ان کو میسّر تھی۔ وہ کہہ سکتے تھے جو کہنا چاہتے تھے لیکن اقبال کے نزدیک ع آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

دنیائے شاعری میں کوئی ایسی مثال نہیں ملے گی کہ کسی شاعر نے ناموافق فضا میں نشو و نما پا کر اقبال کی اتنی ناموری حاصل کی ہو۔ ممکن ہے لوگ ٹیگور کا نام پیش کریں۔ لیکن کہاں ٹیگور جس کے کلام کا نصب العین خیالی تماشا ہے

یا مثالیت پسندی سے زیادہ نہیں اور کہاں اقبال جن کی شاعری خون کو گرمانے والی اور بقول نٹشے و آرنلڈ انکشافِ حیات ہے ٹیگور زندگی کے نشیب و فراز اور طوفان و حوادث کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اقبال تسلیم و انقیاد و نیست و نابود ہونے سے پہلے مقابلہ کی ضرورت جتاتے ہیں غرض اس نظر سے اقبال کو ایک ٹیگور ہی پر موقوف نہیں شکسپیر، ملٹن، گوئٹے اور ایسے ہی دنیا کے دوسرے شاعروں پر برتری حاصل ہے یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ اب ہم ایک دو اشعار درج کرتے ہیں

(۱) جس قوم کے افراد اپنی عارضی فوقیت پر اتراتے ہیں اور جو لوگ ایسے افراد کی غلامی کو باعث فخر سمجھتے ہیں بگوش ہوش سن لیں۔

مذاق دید سے ناآشنا نظر ہے مری — تری نگاہ ہے فطرت کی راز داں پھر کیا؟
رہینِ شکوۂ ایام ہے زباں مری — تری مراد پہ ہے دورِ آسماں پھر کیا؟
رکھا مجھے چمن آوارہ مثلِ موجِ نسیم — عطا فلک نے کیا تجھکو آشیاں پھر کیا؟
فزوں ہے سود سے سرمایۂ حیات ترا — مرے نصیب میں ہے کاوشِ زیاں پھر کیا؟
ہوا میں تیرے پھرتے ہیں تیرے طیارے — مرا جہاز ہے محرومِ بادباں پھر کیا؟
قوی شدیم چہ شد؟ ناتواں شدیم چہ شد؟ — چنیں شدیم چہ شد؟ یا چناں شدیم چہ شد؟

؎ قدردانانِ ٹیگور چیں بجبیں نہ ہوں کبھی تفصیل سے کچھ لکھا جائے گا۔

ہیچ گونہ دریں گلستاں قرارے نیست
تو گر بہار شدی، ما خزاں شدیم، چہ شد؟

(۲) خلافت جیسی عزیز شئے کو مسلمان اپنے زور و بازو سے حاصل کرنے کے عوض اغیار سے مانگتے ہیں تو اُن کو تاریخ یہ سبق دیتی ہے ۔

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

(۶) اقبال شاعروں کے شاعر نہیں ہیں وہ شعر اُسی وقت کہتے ہیں جب (الف) سائنس، فلسفہ، سیاست، تصوف، مذہب یا اخلاق کے باریک مسائل حل کرنا چاہتے ہیں یا (ب) مناظر قدرت دیکھتے ہیں یا (ج) واقعات و انقلابات سے متاثر ہوتے ہیں یا اسی قبیل کے دوسرے احساسات و تحریکات اُن کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں لیکن ذیل کے اشعار میں پہلے اقبال کی طبعی خصوصیتوں کی جھلک دیکھ لیجئے۔

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

تیرے ہنگاموں سے اے دیوانۂ رنگیں نوا ‏ ‏ زینتِ گلشن بھی ہے آرائشِ صحرا بھی ہے

ہم نشیں تاروں کا ہے تو رفعتِ پرواز سے ‏ ‏ اے زمیں فرسا قدم تیرا فلک پیما بھی ہے

عین شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز ‏ ‏ کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے

مثلِ بوئے گل لباسِ رنگ سے عریاں ہے تو ‏ ‏ ہے تو حکمت آفریں لیکن تجھے سودا بھی ہے

جانبِ منزل رواں بے نقشِ پا مانندِ موج ‏ ‏ اور پھر افتادہ مثلِ ساحلِ دریا بھی ہے

حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لئے ‏ ‏ پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

تیری ہستی کا ہے آئینِ تفنن پر مدار ‏ ‏ تو کبھی ایک آستانے پر جبیں فرسا بھی ہے

ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب ‏ ‏ اے تلون کیش تو مشہور بھی رسوا بھی ہے

لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بے تابی کے صدقے ہے عجب بے تاب تو

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے ‏ ‏ مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے ‏ ‏ مضطرب ہوں دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر ‏ ‏ حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

بے نیازی سے ہے پیدا میری فطرت کا نیاز ‏ ‏ سوز و سازِ جستجو مثلِ صبا رکھتا ہوں میں

موجبِ تسکیں تماشائے شرارِ جستۂ ‏ ‏ ہو نہیں سکتا کہ دل برق آشنا رکھتا ہوں میں

ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش — آہ! وہ کامل تجلّی مدعا رکھتا ہوں میں

جستجوئے کُل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے — حسن بے پایاں ہے دردِ لادوا رکھتا ہوں میں

زندگی الفت کی درد انجامیوں سے ہے مری — عشق کو آزادِ دستورِ وفا رکھتا ہوں میں

سچ اگر پوچھے تو افلاسِ تخیل ہے وفا — دل میں ہر دم اک نیا محشر بپا رکھتا ہوں میں

فیضِ ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب — تشنۂ دائم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا — نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

محفلِ ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن — پھر تخیل کس لئے لا انتہا رکھتا ہوں میں

در بیابانِ طلب پیوستہ می کوشیم ما
موجِ بحریم و شکستِ خویش بردوشیم ما

(ا) مذاق سخن رکھنے والے اصحاب جانتے ہیں کہ علمی مسائل کو شاعرانہ انداز میں بیان کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ لیکن اقبال سائنس و فلسفہ کی مشکلات کو پانی کر کے بہاتے ہیں چنانچہ

(ا) اسپنسر کے اس کلیہ کو کہ کوئی شئے لاشے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اشیا صرف اپنا قالب اور ہئیت بدلتی رہتی ہیں ذیل کے شعر میں ظاہر کرتے ہیں

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل — عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

(۲) ذیل کے شعر میں علم الحیات کا یہ اصول بتاتے ہیں کہ ہر ایک فرد اس جماعت کا ہر بات میں پابند ہے جس کا کہ اس سے تعلق ہے اور اس کی ہستی اعتباری ہے اس لئے اگر وہ زندگی چاہتا ہے تو اس کو جماعت کے ساتھ اپنا رشتہ منقطع نہ کرنا چاہئے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ۔۔۔ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس شعر کا مطلب خود اقبال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"کائنات عالم میں زندگی کی لہر کو میں ایک وسیع سمندر تصور کرتا ہوں جس میں چھوٹی چھوٹی موجیں نامعلوم طور پر معرض وجود میں آتی ہیں۔ یہ موجیں محدود اور غیر مشترک انفرادی حیثیتوں میں ایک دوسرے سے ایسا ربط رکھتی ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتا۔ ہر موج بجائے خود ایک عالم ہے (نفس) تاہم وہ اپنے جیسے دوسرے عالموں کے ساتھ مربوط ہے۔ دہرکسانی! زندگی کے ان دو ابتدائی اور اصولی نظریوں کو قائم کرنے میں یورپ کے فلسفیوں کو کئی صدیاں درکار ہوئیں۔ لیکن قرآن مجید اس نظریہ کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے وَخَلَقْنَاكُمْ فِي نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (اور ہم نے پیدا کیا تم کو نفس واحد سے) یہ ظاہر ہے کہ ہر موج سمندر میں رہ کر اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھتی ہے اور سمندر سے الگ ہو کر وہ اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے تھوڑی سی غور سے یہ بات

معلوم ہوگا کہ ہر فرد افراد کے اس مجمع عظیم میں اپنے ماحول کا کس قدر ممنون ہے جسم جو ہماری ہستی کو مادی مفہوم میں بطور فرد کے مشخص کرتا ہے زبان جو ہم بولتے ہیں، لباس جو ہم پہنتے ہیں، اور بڑی حد تک خیال جو ہم سوچتے ہیں اور مذہب جس پر ہم اپنی زندگی کو منحصر رکھتے ہیں وہ سب اسی جماعت کے اوضاع و اطوار کے پابند ہیں جس میں کہ ہم پیدا ہوتے ہیں"۔

اقبال اس اصول کو متعدد مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔ ایک اور مثال لیجئے۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ ۔۔۔ ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ ۔۔۔ پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

(ب) اقبال کے فلسفیانہ خیالات کو بعض لوگ نیٹشے کے نظریے سمجھتے ہیں یہ خیال صحیح نہیں دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ نیٹشے خدا کا، مذہب کا اور اخلاق کا منکر ہے وہ ڈارون کے مسئلہ "تنازع للبقا" کو قطعی تسلیم کرتا ہے اور اپنے فلسفہ کی بنیاد محسوسات پر رکھتا ہے۔ اقبال بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا میں اگر ارتقائے زندگی بالکلیہ "قانونِ قدرت" کے تابع ہو جائے تو طاقتور ہستیاں کمزور پر غالب آجائیں گی لیکن وہ بجا کہتے ہیں کہ اس طرح غالب آتی ہیں جو قوت صرف ہوتی ہے اس قوت کا مذہب اور اخلاق کی اشاعت کے سبب

گھٹ جانا لازمی ہے کیونکہ مذہب سے قادر مطلق' ایثار محض' اور حیات جاوید کی تخئیل پیدا ہوتی ہے جو طاقتور اور کم زور ہستیوں کی کشمکش پر روک تھام کا کام دیتی ہے اس لئے وہ خدا کے' مذہب کے' اور اخلاق کے قائل ہیں یہ ہے نٹشے اور اقبال میں اصولی فرق جس پر مزید بحث کی یہاں گنجائش نہیں یہ اشعار ملاحظہ ہوں

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ ۔۔۔ ناداں ہیں جن کو ہستئ غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا ۔۔۔ ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی ۔۔۔ اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام ۔۔۔ ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور ۔۔۔ مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش

"با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش"

اقبال نرے فلسفی نہیں ہیں بلکہ ان کی نادر و فن خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ وہ فلسفہ میں رجائیت بھر دیتے ہیں اور مصیبت میں راحت' تخریب میں تعمیر' اور موت میں زندگی دیکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک وہ دن دور نہیں کہ آسمان حق و صداقت کی روشنی سے چمک اُٹھے گا اور

جہل و باطل کی ظلمت کافور ہو جائے گی۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش ‏ ‏ ‏ اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے ‏ ‏ ‏ یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

(۳) اِن اشعار میں رازِ حیات بتاتے ہیں۔

فرقتِ آفتاب میں کھاتی ہے پیچ و تاب صبح ‏ ‏ ‏ چشمِ شفق ہے خوں فشاں اخترِ شام کے لئے

رہتی ہے قیسِ روز کو لیلیٰ شام کی ہوس ‏ ‏ ‏ اخترِ صبح مضطرب تابِ دوام کے لئے

کہتا تھا قطبِ آسماں قافلۂ نجوم سے ‏ ‏ ‏ ہمرہو! میں ترس گیا لطفِ خرام کے لئے

سوتوں کو ندیوں کا شوق بحر کا ندیوں کو عشق ‏ ‏ ‏ موجۂ بحر کو تپش ماہِ تمام کے لئے

حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں ‏ ‏ ‏ کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لئے

رازِ حیات پُوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

(۴) نیوٹن کے اس نظریہ کو کہ ہر عمل کے ساتھ ردّ عمل لازمی ہے۔

For every action there is an equal and opposite reaction.

یوں سمجھاتے ہیں:۔

ہر عمل کے لئے ہے ردِّ عمل ‏ ‏ ‏ دہر میں نیش کا جواب ہے نیش

شیر سے آسمان لیتا ہے انتقام غزال و اشتر و میش

شمع پروانہ را بسوخت ولے
زود بریاں شود بہ روغنِ خویش

(۵) جو لوگ اقبال کو محض مشکل گو سمجھتے ہیں دیکھیں کہ وہ مشکل باتیں آسان زبان میں کس خوبصورتی کے ساتھ ذیل کی نظموں میں بیان کرتے ہیں۔

زندگی حرکت اور کشمکش کا نام ہے سکون و قرار کا نہیں۔

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے ۔ تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر ۔ ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا ۔ چلنا چلنا مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شئے ۔ کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کش سفر سب ۔ تارے انساں شجر حجر سب
ہوگا کبھی ختم یہ سفر کیا؟
منزل کبھی آئے گی نظر کیا؟

کہنے لگا چاند۔ ہم نشینو! ۔ اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں!
جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حُسن
آغاز ہے عشق انتہا حُسن

چاند اور تارے ہر شخص دیکھتا ہے لیکن ہر شخص اُن سے وہ درس حاصل نہیں کرتا جو اقبال کی چشم بینا حاصل کرتی ہے۔

ایک پہاڑ اور گلہری

دنیا کا کوئی ذرہ بیکار نہیں پیدا کیا گیا۔

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
ذرہ سی چیز ہے۔ اِس پر غرور کیا کہنا!
یہ عقل اور یہ سمجھ۔ یہ شعور! کیا کہنا!
خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں!
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں!
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے؟
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے
جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں

بھلا پہاڑ کہاں ۔ جانور غریب کہاں!

کہا یہ سن کے گلہری نے منہ سنبھال ذرا ۔ یہ کچی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا ۔ نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے ۔ کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اُس نے ۔ مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں ۔ نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں؟
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو ۔ یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

انسان

راز دہر کی جستجو میں انسان سراپا حیرت ہے

قدرت کا عجیب یہہ ستم ہے؟

انسان کو راز جو بنایا ۔ راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بے تاب ہے ذوق آگہی کا ۔ کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے ۔ آئینے کے گھر میں اور کیا ہے؟
ہے گرمِ خرامِ موجِ دریا ۔ دریا سوئے بحر جادہ پیما

بادل کو ہوا اُڑا رہی ہے — شانوں پہ اُٹھائے لا رہی ہے

تارے مستِ شرابِ تقدیر — زندانِ فلک میں پا بہ زنجیر

خورشید وہ عابدِ سحر خیز — لانے والا پیام "برخیز"

مغرب کی پہاڑیوں میں چھپ کر — پیتا ہے مئے شفق کا ساغر

لذت گیرِ وجود ہر شئے — سرمستِ مئے نمود ہر شئے

کوئی نہیں غمگسارِ انساں!

کیا تلخ ہے روزگارِ انساں!

(۶) مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی قید فرنگ سے رہائی پاتے ہیں تو "سیاسی اسیری" کو یوں آسان اور دل کش کر کے دکھاتے ہیں۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست

ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

جن لوگوں نے مولانا محمد علی کو اخبار کا مرثیہ نکالنے سے پہلے اور مولانا شوکت علی کو

معتمد انجمن خدام کعبہ ہونے سے پہلے دیکھا ہے اُن کو یہ وہم وگمان تک نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ دونوں بھائی آج اسلام کے جان نثاروں کی صف اول میں یوں ممتاز نظر آئیں گے۔ یہ مغربی معاشرت کے مکمل نمونے تھے۔ نے شبہ قید فرنگ ان دونوں کے لیئے نافۂ آہو اور صدف ثابت ہوئی یہ پہلے لہو کی بوند تھے اب مشک اذفر ہیں، پہلے قطرۂ نیساں تھے اب دُرِ شہوار۔ ان دونوں کو ان کی دلیری، جرأت بے باکی اور گرفتاری کے لحاظ سے شہباز وشاہین کے ساتھ تشبیہ دینا کس قدر لطف دے جاتا ہے۔

(۷) ان نظموں میں اقبال ایک صوفی نظر آتے ہیں۔

وصال

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے ۔ خوبی قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے
خود تڑپتا تھا چمن والوں کو تڑپاتا تھا میں ۔ تجھ کو جب رنگیں نوا پاتا تھا شرماتا تھا میں
میرے پہلو میں دل مضطر نہ تھا سیماب تھا ۔ ارتکاب جرم الفت کے لئے بے تاب تھا
نامرادی محفل گل میں مری مشہور تھی ۔ صبح میری آئینہ دارِ شب دیجور تھی

ازنفس درسینۂ خوں گشتہ نشتر داشتم

زیرِ خاموشی نہاں غوغائے محشر داشتم

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں
اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے

غازۂ الفت سے یہ خاکِ سیہ آئینہ ہے
اور آئینے میں عکسِ ہمدمِ دیرینہ ہے

قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی
دل کے لٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی

ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے
چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا واسوختی

حُسن و عشق

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر
نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر

جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل
چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول

جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم
موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

ہے ترے سیلِ محبت میں یونہیں دل میرا

تو جو محفل ہے تو ہنگامۂ محفل ہوں میں
حسن کی برق ہے تو عشق کا حاصل ہوں میں

تو سحر ہے تو مرے اشک ہیں شبنم تیری
شام غربت ہوں اگر میں تو شفق تو میری

مرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے
تری تصویر سے پیدا مری حیرانی ہے

حسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا

ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار
میرے بے تاب تخیل کو دیا تو نے قرار

جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں

حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال

قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

ستارۂ صبح

ستارہ صبح کا روتا تھا اور یہ کہتا تھا
ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی

ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شئے
اماں مجھی کو تہہ دامنِ سحر نہ ملی

بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی
نفس حباب کا تابندگی شرارے کی

کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبینِ سحر!
غمِ فنا ہے تجھے! گنبدِ فلک سے اتر

ٹپک بلندیٔ گردوں سے ہمرہِ شبنم
مرے ریاضِ سخن کی فضا ہے جاں پرور

میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی
بنا مثالِ ابد پائدار ہے اس کی

غنچۂ ناشگفتہ اور آفتاب

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگیں اپنا ٭ کھول دیتی ہے کلی سینۂ زریں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں
سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

مرے خورشید! کبھی تو بھی اُٹھا اپنا نقاب بہرِ نظارہ تڑپتی ہے نگاہِ بے تاب
تیرے جلوہ کا نشیمن ہو مرے سینہ میں عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں
زندگی ہو ترا نظارہ مرے دل کے لئے روشنی ہو تری گہوارہ مرے دل کے لئے
ذرہ ذرہ ہو مرا پھر طرب اندوزِ حیات ہو عیاں جوہرِ اندیشہ میں پھر سوزِ حیات
اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں صفتِ غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں
جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کر دوں

(۸) جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے　　شجر میں پھول میں حیواں میں پتھر میں ستارے میں

اس شعر میں کہتے ہیں کہ تمام مخلوقات کے اندر ایک ہی روح کام کر رہی ہے جو کہیں بیدار ہے اور کہیں خوابیدہ۔

(۹) ظفر کی ایک مشہور نعت کا شعر ہے۔

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو　　یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں

یہی خیال اقبال اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو　　چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو　　بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

(۱۰) اقبال کی بعض نظموں میں متضاد خیالات ہیں۔ اس کی مختصر توضیح یہ ہے بیسویں صدی کے اوائل میں جب مغرب کی تہذیب مشرق کے تمدن پر غالب آ گئی ہے جب ہندوستان مغرب کا حلقہ بگوش اور مقلد بن جاتا ہے۔ جب ہندوستانیوں کا یہ عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے کہ مختلف المذاہب قومیں جب تک ایک قومیت کے دائرہ میں نہ داخل ہو جائیں اور جب وطن کو اپنا اصل اصول نہ بنا لیں اُس وقت تک ملکی

ترقی محال ہے، اقبال کی شاعری کی نشو ونما شروع ہوتی ہے اس لئے وہ ابتدا میں اپنے ہم وطنوں کے خیالات اور اعتقادات کے اثرات سے نہیں بچتے اور وطن پرستی و قومیت پسندی کے یہ راگ گاتے ہیں۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے
ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
رنگِ قومیّت مگر اس سے بدل سکتا نہیں خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں

یہ ان کی شاعری کا پہلا دور ان کے یورپ جانے سے پہلے کا ہے جو ۱۸۹۷ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۵ء پر ختم ہو جاتا ہے یہاں تک وہ ہندوستان کے شاعر ہیں اور ان کی شاعری وطنیت اور قومیت کے جذبات پر مبنی ہے لیکن ۱۹۰۶ء سے سنہ رواں تک یعنی ان کے یورپ میں قیام اور یورپ سے واپسی کے بعد ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں وہ بین الاقوامی شاعر بن جاتے ہیں اور ان کی شاعری کو انسانیت اور اسلامیت کا لقب دیا جا سکتا ہے اُن کے دہنے ہاتھ میں قرآن کی تلوار اور بائیں میں فلسفہ کی سپر آجاتی ہے۔ ان میں وطن پرستی باقی رہتی ہے نہ قومیّت پسندی بلکہ ان کے نغموں کا رنگ اس طرح بدل جاتا ہے۔

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال کے خیالات میں اس زبردست انقلاب اور ان کی اس دماغی ارتقا کے اسباب بہت دلچسپ اور بڑی تفصیل کے محتاج ہیں۔ یہاں اُن کے

مغربی فلسفہ کے مطالعہ کے نتائج سے قطع نظر کرکے اس قدر کہنا کافی ہے کہ اُن پر علامہ شبلی کے اِن خیالات کا ضرور اثر ہے

"دنیا میں عموماً ہر قوم کو مذہب ہر چیز سے زیادہ عزیز رہا ہے لیکن مسلمانوں کو اور بھی زیادہ عزیز تھا اور ہونا چاہئے تھا۔ مسلمان کسی نسل کسی خاندان کسی ملک کسی آبادی کے افراد کا نام نہیں مسلمانوں کی قومیت کا عنصر یا مایۂ خمیر جو کچھ کہو صرف مذہب ہے اس لئے اگر مذہب کی حیثیت الگ کرلی جائے تو قومیت بھی فنا ہو جاتی ہے اسی خیال کا اثر تھا کہ مسلمانوں نے مذہب کو ہر قسم کے خطروں سے بچانے کے لئے ہر زمانہ میں حیرت انگیز کوششیں کیں۔

دولت عباسیہ میں جب یونان و فارس کے علمی ذخیرے عربی زبان میں آئے اور تمام قوموں کو مذہبی مباحثات و مناظرات میں عام آزادی دی گئی تو اسلام کو ایک بڑے خطرے کا سامنا پیش آیا۔ پارسی۔ عیسائی۔ یہودی۔ زنادقہ۔ ہر طرف اُٹھ کھڑے ہوئے اور فتوحاتِ اسلام کے آغاز میں اُن کو جو صدمہ اسلام کی تلوار سے پہنچ چکا تھا اس کا انتقام قلم سے لینا چاہا۔ عقائد و مسائلِ اسلام پر اس آزادی اور بے باکی سے نکتہ چینیاں کیں کہ ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے اعتقاد متزلزل ہو گئے۔

اس وقت اگرچہ نہایت آسانی سے ممکن تھا کہ حکومت کے زور سے نکتہ چینوں کی زبانیں بند کردی جاتیں لیکن مسلمانوں کی آزاد خیالی نے اس ننگ کو گوارا نہ کیا کہ قلم کا جواب تلوار سے

دیا جائے۔ علمائے اسلام نے نہایت شوق اور محنت سے فلسفہ سیکھا اور جو ہتھیار مخالفین نے اسلام کے مقابلہ میں استعمال کئے تھے اِن ہی سے ان کے وار رد کئے۔"

(ب) ورڈس ورتھ کی طرح اقبال قدرت کے زبردست پرستار ہیں۔ کیا خوب کہتے ہیں ع عاشقِ فطرت کو ہے صحنِ گلستاں کوئے یار۔

مناظرِ قدرت کے وہ اعلیٰ درجہ کے مصور ہیں چنانچہ بادل کی یہ تصویر۔

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا — سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سر بن کا
نہاں ہوا جو رخِ مہر زیرِ دامنِ ابر — ہوائے سرد بھی آئی سوارِ توسنِ ابر
گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا — عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا
چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے — قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے
جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اٹھے — زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے اُٹھے
ہوا کے زور سے اُبھرا بڑھا اُڑا بادل — اٹھی وہ اور گھٹا لو برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نہالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھرنے والوں کا

(۲) غروبِ آفتاب کا یہ عکس۔

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام — لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام

(۳) رات کا یہ نقشہ

ظلمتِ آشفتہ کا کل وسعتِ عالم میں ہے — اشکِ انجم در گریباں روز کے ماتم میں ہے
طفلکِ شش روزۂ کون و مکاں خاموش ہے — رات کے آغوش میں لپٹا ہوا بیہوش ہے
آبِ دریا خفتہ ہے موجِ ہوا غش کردہ ہے — پست ہر ہستی کے سازِ زندگی کا پردہ ہے
کیسی حجت خیز ہے ظلمت فروشی رات کی — دل کے ہنگاموں کا مدفن ہے خموشی رات کی

(۴) اور طلوعِ صبح کا یہہ مرقع ملاحظہ ہو ۔

۱ پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح — داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہہ — بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ
خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار — ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہم کنار
۲ پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر — کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے — بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار
ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے — سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار
کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی — کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آبدار
ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیزِ صبح — شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہم کنار
جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج — ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

شکسپیر صبح کا منظر ایک جگہ یوں دکھاتا ہے۔

"اے لوسبک خرام چنڈول نے جی بھر استراحت کے بعد شبنم آلود آشیانے سے نکل کر آسمان کی طرف پرواز کی ساتھ ہی صبح نے انگڑائی لی اور اس کی آغوش میں سے آفتاب بکمال شان و تجمل جلوہ نما ہوا۔ ادھر دنیا پر اس نے ایک نورانی نگاہ ڈالی ادھر درختوں اور پہاڑوں کی چوٹیاں کندن کی طرح جگمگانے لگیں"

شکسپیر کے الفاظ پر شان و شوکت ہیں لیکن اقبال کا انداز بیان کچھ کم شاندار نہیں۔ اقبال کے اشعار پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ گویا اس کی آنکھ ابھی کھلی ہے اور اس کے سامنے صبح ہو رہی ہے۔ ایک طرف ناقوس و اذاں کی آوازیں کان میں پڑ رہی ہیں دوسری طرف قمری و بلبل چہچہا رہے ہیں اور ہر شے میں زندگی کی ایک آگ دوڑ گئی ہے۔

آگ سے روشنی پھیلتی ہے اس مناسبت سے یہ کہنا کہ طلوع صبح کے باعث ہر شے آتش قبا ہو جاتی ہے اس بیان سے بہتر ہے کہ ہر چیز سونے کی طرح چمکنے لگتی ہے۔

(۵) ذیل کے اشعار میں "آفتاب صبح" کا جلوہ ملاحظہ فرمائیے۔

شورشِ میخانۂ انساں سے بالاتر ہے تو — زینتِ بزمِ فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو
ہو دُرِ گوشِ عروسِ صبح وہ گوہر ہے تو — جس پہ سیمائے اُفق نازاں ہو وہ زیور ہے تو

صفحۂ ایام سے داغِ مدادِ شب مٹا | آسماں سے نقشِ باطل کی طرح کوکب مٹا
حسن تیرا جب ہوا بامِ فلک سے جلوہ گر | آنکھ سے اُڑتا ہے یکدم خواب کی مے کا اثر
نور سے معمور ہو جاتا ہے دامانِ نظر | کھولتی ہے چشمِ ظاہر کو ضیا تیری مگر
ڈھونڈتی ہیں جس کو آنکھیں وہ تماشا چاہیئے | چشمِ باطن جس سے کھل جائے وہ جلوا چاہیئے
شوقِ آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے | زندگی بھر قیدِ زنجیرِ تعلق میں رہے
زیر و بالا ایک ہیں تیری نگاہوں کے لئے | آرزو ہے کچھ اسی چشمِ تماشا کی مجھے
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو | امتیازِ ملت و آئیں سے دل آزاد ہو
بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں | نوعِ انساں قوم ہو میری وطن میرا جہاں
دیدۂ باطن پہ رازِ نظمِ قدرت ہو عیاں | ہو شناسائے فلک شمعِ تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے | حسنِ عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے
صدمہ آ جائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر | اشک بن کر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر
دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر | نور سے جس کے ملے رازِ حقیقت کی خبر
شاہدِ قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہ ہو | سر میں جز ہمدردیٔ انساں کوئی سودا نہ ہو
تو اگر زحمت کشِ ہنگامۂ عالم نہیں | یہ فضیلت کا نشاں اے نیرِ اعظم نہیں
اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں | ہمسرِ یک ذرۂ خاکِ درِ آدم نہیں

نورِ مسجودِ ملک گرمِ تماشا ہی رہا | اور تو منت پذیرِ صبحِ فردا ہی رہا
آرزو نورِ حقیقت کی ہمارے دل میں ہے | لیلیٰ ذوقِ طلب کا گھر اسی محمل میں ہے
کس قدر لذت کشودِ عقدۂ مشکل میں ہے | لطفِ صد حاصل ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
دردِ استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں | جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں

(ج) (۱) کفر و ایمان ہمیشہ سے دست و گریباں ہیں جیسا کہ اقبال کہتے ہیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

سالہا سال سے عیسائیت کی متواتر یورشوں کے باوجود اسلامیت بے حس تھی لیکن آخر کار ۱۹۱۱ء کی جنگ طرابلس مسلمانوں کو تازیانۂ بیداری کا کام دیتی ہے تمام عالم اسلامی میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ترک اور عرب شاعر رجز خوانی شروع کرتے ہیں چنانچہ۔

(۱) قسطنطنیہ کا نامور شاعر کمال شکری[1] لکھتا ہے "کاش میں طرابلس کی سرزمین میں ہوتا کاش میں اُن بہادر عربوں کو دیکھ سکتا جو انور بے کے ہلال علم کے سایہ میں اپنے حملہ آوروں کا جواب دے رہے ہیں۔ ...... غیرتمند عرب عورتوں نے مردوں کو جوش دلایا ہے اور

[1] بعض ادیب شکری کو قسطنطنیہ کا شکسپیر کہتے ہیں۔

میدان جنگ میں خود آگے بڑھ کر ان کے دلوں کو زندہ کر دیا ہے............ میں بھی انہیں میں

ایک ہوں جنکے دل خاتونوں کی جوشیلی تقریر سے دلیر ہو گئے ہیں میری طبیعت میں قومی حرارت

بھڑک اُٹھی ہے۔ اگر دشمن کے جہاز میرے رستہ میں حائل نہ ہوتے تو میں اپنے تئیں بہت جلد طرابلس کے

ساحل پر پاتا اور بہت سے غیرتمند نوجوان ترک بھی ہوتے۔"

(۲) ایک اور ترکی شاعر کہتا ہے۔

کھول ہے آنکھ تو نے طغرل کے گھر میں آکر ترکوں کے خون سے تو سینچا گیا ہے اکثر

لہرا چکا ہے برسوں دشمن کے مورچوں پر تجھ پر سلام ہوا ے عثمانیوں کے جھنڈے

اے سلطنت کے بانیٔ اقبال کی نشانی اور اے لڑائیوں کی تاریخ کی کہانی

ہے منحصر تجھی پر ترکوں کی شادمانی عثمانیوں کے چولھے تجھ بن رہیں گے ٹھنڈے

(۳) اسکندریہ کا ایک عرب شاعر عبدالحمید تحریر کرتا ہے۔

"اے مصر کے زندہ دل مسلمانو ان زخمیوں کی تیمار داری کے لئے جو میدان جنگ میں شجاعت کا

تمغہ حاصل کرتے ہیں فیاضی کا ہاتھ بڑھاؤ۔ ان یتیموں اور بیواؤں کی امداد کے لئے جن کے

سرپرست اطالویوں کے ہاتھ سے جام شہادت پی چکے ہیں اپنے جیبوں کے منہ کھول دو

.... تمھارے آنسو جو رخساروں پر بہہ نکلتے ہیں بتاتے ہیں کہ قومی محبت کی چنگاریاں

تمہارے دلوں کے اندر دہک رہی ہیں۔ دیکھو! یہ چنگاریاں بجھنے نہ پائیں۔ یہ آنسو تھمنے

نہ پائیں یہ ہاتھ فیاضی سے رُکنے نہ پائیں۔ اسلام دعویٰ کرتا ہے کہ تمام مسلمان مثل ایک جسم کے ہیں کہ اگر ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو دوسرا عضو بھی درد سے بے چین ہو جاتا ہے۔ کیا اے مصر کے مسلمانو! تم اس دعوے کو ثابت کرسکتے ہو؟"

لیکن اقبال کی نظر داخلی احساس سے خارجی کیفیت تک پہنچتی ہے اس لئے جنگ کے اندرونی اسباب یعنی مسلمانوں کی بے دینی خود فراموشی اور کمزوری پر وہ پہلے نگاہ ڈالتے ہیں پھر بارگاہ نبوی میں سادگی جوش اور صلیت کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ۔

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی ۔۔۔ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں ۔۔۔ وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں ۔۔۔ جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اور انقلاب سے متاثر ہو کر کس لطافت کے ساتھ یہ رمز بتاتے ہیں کہ جس آبگینہ میں ہماری آبرو جھلکتی ہے وہ ہمیں جنت سے بھی زیادہ عزیز ہونا چاہئے۔

(۲) اسی جنگ کے زمانہ میں ایک عرب لڑکی فاطمہ نامی جو غازیان طرابلس کو عین

میدان کارزار میں پانی پلاتی پھرتی تھی شہید ہوتی ہے تو اس واقعہ پر ایک ایسی نظم لکھتے ہیں جس میں بلا کا درد و اثر اور غضب کا سوز و گداز ہے جس کا ہر مصرع دل دوز اور غیر فانی ہے اس کے یہ اشعار سنئے۔

فاطمہ تو آبروئے ملّتِ مظلوم ہے ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
کس قدر عزت تجھے اے حورِ صحرائی ملی غازیانِ ملّتِ بیضا کی سقائی ملی
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر دل کہ برگ نازکِ گل سے بھی تھا پاکیزہ تر
موت کے اندیشۂ جاں کاہ سے بیگانہ تھا موجۂ خوں کی ہم آغوشی سے بھی ڈرتا نہ تھا

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں
یعنی نوزائیدہ تاروں کا فضا میں ہے ظہور دیدۂ انسانِ نامحرم ہے جن کی موجِ نور
ہے ابھی جن کے لئے رفتار کی لذت نئی آسماں کا خم نیا وسعت نئی عظمت نئی

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی نو بھی ہے
اور خونِ بنتِ عبداللہ کا پرتو بھی ہے

ان میں تخئیل کتنی نازک، بلند اور رجائیت آمیز ہے۔ عرصۂ کارزار میں ایک لڑکی

کام آتی ہے تو اُس کی موت میں شاعر کو ہنگامۂ حیات اور ایک ایسی قوم کی پیدایش نظر آتی ہے جو مذہب کی قدیم روایتوں کے ساتھ موجودہ زمانے کی ضرورتوں سے مسلح رہے گی۔ اس لئے فاطمہ کا ماتم اسلام کے روشن مستقبل اور دائمی مسرت کا پیش خیمہ ہے فی الحقیقت جو قوم صفحۂ عالم پر ایسی شجیع لڑکی کا نام ثبت کرسکتی ہے اُس کا دوبارہ زندہ ہونا اور دنیا کی کایا پلٹ دینا کیا کوئی تعجب کی بات ہے؟ کیا دنیا کی کوئی اور قوم فاطمہ کی نظیر پیش کرسکتی ہے؟

جنگ طرابلس، جنگ بلقان اور جنگ یورپ کے بعد سے مسلمانوں کی منتشر حالت دیکھ کر بعض حامیان تہذیب جدید اسلام کو گل پژمردہ سمجھنے لگے ہیں۔ ایسے اصحاب اقبال کی نظم[1] فاطمہ اور اُسی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی دوسری نظمیں خصوصیت کے ساتھ پڑھیں۔

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور

ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

(۳) خصوصیاتِ شاعری کا چھٹا نشان ذیل کی متفرق سطروں پر ختم کردیا جاتا ہے۔

---

[1] اقبال کی ایسی نظموں کے ترجمے قسطنطنیہ کے ترکی اخبار "تصویر افکار" میں اکثر چھپتے رہتے ہیں۔

(۱) اقبال نے اُنیس سال پہلے علی گڈھ کالج کے طلبہ کو یہہ پیام بھیجا تھا۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے — عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے
طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم — یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے
آئی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں — کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے
جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا — اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو — گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے
شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز — غم کدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

(۲) ملک الشعرائے امریکہ "لانگ فیلو" کی نظم "نغمۂ حیات" بہت مشہور ہے لیکن زندگی کی آگ ذرا ان اشعار میں دیکھئے۔

برتر از اندیشۂ سوز و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب — اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو ‌ ‌ پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنگار تو

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ ‌ ‌ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار

اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

(۳) عمر خیام کے ہاتھ سے ایک دفعہ ساغرِ مے چھلک کر زمین پر آ رہا تھا تو اس نے یہ مشہور رباعی لکھی تھی۔

ابریقِ مئے مرا شکستی ربّی ‌ ‌ برمن درِ عیش را ببستی ربّی

برخاک فگندی مئے گلگونِ مرا ‌ ‌ من مست نیم مگر تو مستی ربّی

لیکن اقبال کی قوم دوسری قوموں کی نظر سے گرتی ہے تو وہ خدا سے یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے

بات کہنے کی نہیں، تو بھی تو ہرجائی ہے

(۴) کیا عمر خیام نے زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ اس سے بہتر کھینچا ہے؟

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا ‌ ‌ شاخ پر بیٹھا، کوئی دم چہچہایا، اڑ گیا،

آہ کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم کیا گئے ‌ ‌ زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے، مرجھا گئے

(۴) اقبال کی فلسفیانہ متانت کبھی کبھی مبدل بظرافت ہو جاتی ہے چنانچہ :-

(۱) انگریزی اخبار مسلم آوٹ لک کے اجرا کی اطلاع ملتی ہے تو کہتے ہیں -

لُکَ وِدِنْ کا حکم تھا اس بندۂ اللہ کو اب یہ سنتے ہیں نکلنے کو ہے مسلم آؤٹ لُک

(۲) ترکوں کی سیاست میں یہ کمی دکھاتے ہیں -

ناداں تھے اس قدر کہ نہ جانی عرب کی قدر حاصل ہوا یہی نہ بچے مار پیٹ سے

مغرب میں ہے جہاز بیاباں شتر کا نام ترکوں نے کام کچھ نہ لیا اس فلیٹ سے

(۷) اقبال کا کلام -

(۱) حشو و زوائد سے پاک ہے کسی شعر میں کوئی لفظ بے کن یا بے محل نہیں -

(۲) تمام اصناف سخن رباعیات، قطعات، غزلیات، تضمین، مسدس وغیرہ پر مشتمل ہے

(۳) تمام متداولہ بحروں میں موجود ہے - بحروں اور مضامین میں خاص مناسبت ہے

(۴) نقاشی و مصوری کا پاکیزہ نمونہ ہے -

(۵) ترنم اور موسیقیت سے لبریز ہے -

اقبال بعض اوقات ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ اُن کی آواز و لہجہ سے

اشعار کا مفہوم ذہن میں آجاتا ہے ملاحظہ ہو -

مرا عیش غم، مرا شہد سم، مری بود ہم نفس عدم ترا دل حرم گرو عجم ترا دیں خریدۂ کافری

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

(۸) یوں تو اقبال کے اشعار میں شستہ اور فصیح سے فصیح الفاظ ہوتے ہیں لیکن جہاں کہیں وہ ثقیل لفظ استعمال کرتے ہیں اُن میں ایک طرح کی دلآویزی پیدا کر دیتے ہیں مثلاً اس شعر میں ۔

کس قدر عزت تجھے اے حورِ صحرائی ملی غازیانِ ملتِ بیضا کی سقائی ملی

لفظ سقائی اس حسن و خوبی کے ساتھ جما ہوا ہے کہ مطلق ناگوار نہیں معلوم ہوتا بلکہ معنی اور محلِ استعمال کے باعث اُس میں لطافت پیدا ہو گئی ہے "شتربانوں" کی نشست اس شعر میں ۔

تمدن آفریں خلاقِ آئینِ جہاں داری وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس لفظ کا بھدا پن زائل ہو گیا ہے ۔ اسی طرح بعض اشعار میں اُجھاو ، اکارت اور اٹکٹ جیسے الفاظ یوں استعمال میں آجاتے ہیں کہ باوجود ثقیل ہونے کے ذوقِ سلیم کو نہیں کھٹکتے ۔

(۹) ہر بڑے مصنف کی طرح اقبال بھی نئے الفاظ استعمال کرتے ہیں ذیل کے خط کشیدہ الفاظ ملاحظہ ہوں :-

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی زمیں جولانگہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

اے ہوس خوں روکہ ہے یہ زندگی بے اعتبار — یہ شرارے کا تبسم، یہ خسِ آتش سوار
آہ یثرب دیس ہے مسلم کا تو ماوی ہے تو — نقطہ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

نیز یہ الفاظ۔ شعلۂ گردوں نورد، ہر دو ار دل، تہذیب حاضر، زندانی تقدیر، طلب خو، تپش آمادہ، ثریا نشاں، گلستاں زادہ، سیماب پا، موسیٰ کلامی وغیرہ

(۱۰) ایک طرف قدیم طرز کی شاعری میں صنعتوں کا استعمال بڑا کمال سمجھا گیا ہے دوسری جانب دلدادگان طرز جدید کو اکثر یہ سوجھتی رہی ہے (اور بارہا انھوں نے کوشش کی ہیں) کہ اردو زبان کی شاعری میں بے قافیہ نظم کو رواج دیا جائے۔ لیکن آج تک اُن کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اقبال شاعری سے ایک پر منفعت کام لیتے ہیں نہ تو وہ دوراز کار تشبیہات، بے جا استعارات، بے قافیہ اشعار یا ایسے دوسرے مزخرفات پر نظر ڈالتے ہیں اور نہ کبھی صنائع اور بدائع میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں بلکہ ایشیائی طرز ادا کے ساتھ، ردیف و قوافی ہی کی قید میں نظمیں لکھتے ہیں یہ بھی ایک وجہ ان کی مقبولیت کی ہے۔ یہ نظمیں کیا بہ لحاظ مضمون و معنی اور کیا بہ لحاظ لطافت و فصاحت نہایت دلکش اور حد درجہ جاذب توجہ ہیں۔ ان کے مطالعہ کا لطف بھی اس سے کسی طرح کم نہیں جو جرعہ خوارانِ آبحیات کی غزلوں میں ہے۔ کنار راوی، طلوع سحر، کوہستان ہمالہ اور جگنو کی نظمیں دیکھئے کس قدر حظ حاصل ہوتا ہے۔ نظم شکوہ ۱۹۱۱ء

میں لکھی گئی تھی لیکن ہندوستان کے ہر گوشہ میں یہ اب تک ایک دو مرتبہ نہیں بیسیوں مرتبہ پڑھی جاتی ہے پھر بھی اس کی لذت کم نہیں ہوتی اس کو جب پڑھئے تازہ معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکوہ اور ترانہ جیسی نظموں کی تقلید میں ہندوستان کے اکثر شاعروں نے نظمیں لکھیں اور لکھتے رہتے ہیں اُن سب کے نزدیک اقبال کی عظمت مسلم ہے اور وہ بجا سمجھتے ہیں کہ شاعری کے دور جدید میں اقبال غالب کا نعم البدل ہے:

ج - اقبال کی تصنیفات

(۱) علم الاقتصاد۔ اس نام سے اقبال نے معاشیات کے مضمون پر ۱۸۹۶ء میں ایک کتاب لکھی جو اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ثابت ہوئی۔

(۲) فلسفۂ عجم۔ ملاحظہ ہو دیباچہ کا صفحہ ۱۶۔

(۳) اسرارِ خودی۔ مولانا روم کی دل کش طرز اور بحر میں فارسی کی وہ مشہور مثنوی ہے جس کی اشاعت نے چند سال پہلے علمی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اس کا موضوع فلسفۂ خودی یعنی یہ تعلیم ہے کہ فطرتِ انسانی کے نہ ختم ہونیوالے وسائل و ذرایع پر کامل یقین رکھ کر ایک فرد کس طرح غیر محدود نشو و نما پا سکتا ہے اس کی شہرت ہندوستان و ایران سے گذر کر مغرب تک پہنچ گئی ہے چنانچہ جب فٹز جیرالڈِ وقت ڈاکٹر نکلسن نے اس کو انگریزی زبان کے لباس سے آراستہ کیا تو یورپ اور امریکہ کے مسلمہ اہل قلم نے اس پر ناقدانہ مضامین لکھے۔

(۴) رموزِ بیخودی۔ فارسی کی دوسری مقبول مثنوی ہے جس کا خوش آیند موضوع یہ ہے کہ فلسفۂ خودی کی روشنی میں جماعتِ اسلام کی ترقی کے اسباب و علل کیا ہیں۔

(۵) پیامِ مشرق۔ فارسی زبان میں معرکہ کی تصنیف ہے اور ملک الشعراء المانیہ گوئٹے کے "دیوان مغرب" کے جواب میں پیش کی گئی ہے۔ یہ نادر اور بے نظیر جواب لکھ کر اقبال نے

مشرق کی لاج رکھ لی ورنہ یہ کام ٹیگور سے بھی نہیں ہوسکا تھا۔

یہ تمام تصنیفات، جو یاس و قنوط سے بری ہیں، اصلاح و ترقی ملک کی کس حد تک ضامن ہوئیں اور آیندہ ہونگی اس کا تبصرہ ہم سے بہتر آنے والی نسلیں کریں گی اور آیا کس حد تک مقبول و مشہور رہوں گے اس کا فیصلہ یا ذوق سلیم کرے گا یا دنیا کے علم ادب کی تاریخ۔

یہ طویل دیباچہ ختم ہو چکا اب نظمیں شروع ہوتی ہیں، یہ نظمیں نہیں "آگ میں تپی ہوئی سوئیاں" ہیں اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں قدسیانہ جذبات اور فلسفیانہ خیالات کا اتنا ذخیرہ اس سے پہلے اردو زبان کی شاعری میں ہرگز نہیں ملے گا۔ کیا عجب تھا کہ اگر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم اس وقت بقید حیات ہوتے تو اس کتاب کو وہ ہندوستان کی "تیسری الہامی" کتاب سمجھتے۔

بہر کیف کیا یہ مجموعہ "دیوان غالب" کی طرح

یکتا

سمجھے جانے کا مستحق نہیں ہے؟

محمد عبدالرزاق (ایچ۔ سی۔ ایس)
(اسسٹنٹ اکاونٹنٹ جنرل سررشتہ فینانس سرکار عالی)

باغ عبدالرزاق۔ حیدرآباد دکن
۳۱ ڈسمبر ۱۹۲۲ء م ۲۲ جمادی الاول ۱۳۴۱ھ

عماد پریس میں چھپا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مے دو آتشہ

غزلیات

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا — سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے — بنے گا سارا جہان میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر — جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا — سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا — ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

جنہوں نے میری زبانِ گویا کو محشرستانِ صدا کا جانا — مرا وہ دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوتِ مزار ہوگا

چمن میں لالہ دکھاتا پھرتا ہے داغ اپنا کلی کلی کو — یہ جانتا ہے کہ اس دکھاوے سے دل جلوں میں شمار ہوگا

کہا جو قمری سے میں نے اک دن یہاں کے آزاد پا بہ گل ہیں — تو غنچے کہنے لگے۔ ہمارے چمن کا یہ رازدار ہوگا

یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دل گناہ ہے جنبشِ نظر بھی — رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا — تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آ بسیں گے — برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا

کیا مرا تذکرہ جو ساقی نے بادہ خواروں کی انجمن میں — تو پیرِ میخانہ سنکے کہنے لگا کہ منہ پھٹ ہے خوار ہوگا

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

جو ایک تھا اک نگہ میں تونے ہزار کرکے ہمیں دکھایا — یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے — میں اس کا بندہ بنوں گا جسکو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

میں ظلمتِ شب میں لیکے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو — شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

نہ پوچھ **اقبال** کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اسکی
کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھیگا گفتگو کا — مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

جو موجِ دریا لگی یہ کہنے سفر سے قائم ہے شان اپنی — گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھکو سامان آبرو کا

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے — ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جو کا

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا — الٰہی تیرا جہان کیا ہے نگار خانہ ہے آرزو کا

اگر کوئی شی نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں — نگہ کو نظارے کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا

چمن میں گلچیں سے غنچہ کہتا تھا اتنا بیدرد کیوں ہے انساں — تری نگاہوں میں ہے تبسم شکستہ ہونا مرے سبو کا

کھلا یہ مرکر کہ زندگی اپنی تھی طلسمِ ہوس سراپا — جسے سمجھتے تھے جسمِ خاکی غبار تھا کوئی آرزو کا

ریاضِ ہستی کے ذرّے ذرّے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو دیکھے تو یہ بھی پیمان ہے رنگ و بو کا

سپاس شرطِ ادب ہے ورنہ کرم ترا ہے ستم سے بڑھکر -
ذرا سا اک دل دیا ہے وہ بھی فریب خوردہ ہے آرزو کا

اڑایا ذوقِ تپش پتنگے نے شمع سے شوقِ اشکباری -
کہیں سے سیکھی نماز میں نے لیا کہیں سے سبق وضو کا

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

جو چاک میرے جگر کے دیکھے کلی نے بادِ صبا سے پوچھا
یہ آدمی ہے کہ گل ہے منت پذیر ہے سوزنِ رفو کا

گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رختِ سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

تمام مضموں مرے پرانے کلام میرا خطا سراپا
ہنر کوئی دیکھتا ہے مجھ میں تو عیب ہے میرے عیب جو کا

جو گھر سے اقبالؔ دور ہوں میں تو ہوں نہ محزوں عزیز میرے
مثالِ گوہر وطن کی فرقت کمال ہے میری آبرو کا

عاشقِ دیدارِ محشر کا تمنائی ہوا -
وہ سمجھتے ہیں کہ جرمِ ناشکیبائی ہوا

غیر سے غافل ہوا ہیں اے نمودِ حسنِ یار
عرصۂ محشر میں پیدا کنجِ تنہائی ہوا

میری بینائی ہی شاید مانعِ دیدار تھی -
بند جب آنکھیں ہوئیں تیرا تماشائی ہوا

ہائے میری بدنصیبی وائے ناکامی مری
پانوں جب ٹوٹے تو شوقِ دشت پیمائی ہوا

میں تو اُس عاشق کے ذوقِ جستجو پر مر مٹا -
ما عرفنا کہہ کے جو تیرا تمنائی ہوا

تجھ میں کیا اے عشق وہ اندازِ معشوقانہ تھا
حسن خود لولاک کہکر تیرا شیدائی ہوا

دیکھ ناداں امتیاز شمع و پروانہ نہ کر
حُسن بنکر عشق اپنا آپ شیدائی ہوا

اب ہی شُہرت کی سُوجھی ہے انہیں دیکھے کوئی
پس کے میں جب دم غبار کوئے رسوائی ہوا

کیا کہوں اپنے وطن سے میں جدا کیونکر ہوا
اور اس پر حلقۂ دام ہوا کیونکر ہوا

جائے حیرت ہے بُرا سارے زمانے کا ہوں میں
مجھ کو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا

ہے طلب بے مدعا ہونے کی بھی اک مُدعا
مرغ دل دام تمنا سے رہا کیونکر ہوا

حُسن کامل ہی نہ ہو اس بے حجابی کا سبب
وہ جو تھا پردوں میں پنہاں خود نما کیونکر ہوا

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل
ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا

پرسشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی مری
ورنہ ظاہر تھا سبھی کچھ کیا ہوا کیونکر ہوا

سن اے طلبگار درد پہلو میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومناتِ دل کا ہوں تو سراپا ایاز ہو جا

نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرض قدیم ہے تو ادا مثال نماز ہو جا

دیار خاموشی دل میں ایسا ستم کش درد جستجو ہو
کہ اپنے سینہ میں آپ پوشیدہ صورت حرف راز ہو جا

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری
وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرانوردیوں کا — جہاں میں مانند شمع سوزاں میانِ محفل گداز ہو جا

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی — فدائے ملت ہو یعنی آتش زنِ طلسم مجاز ہو جا

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہِ حجاز ہو جا

ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دہر تمام — سیر اس باغ کی کر بادِ سحر کی صورت

نام روشن تو رہے عمر ہو گو برق خرام — زندگی چاہیئے دنیا میں شرر کی صورت

یہ تو بتلا دے مؤذن کہ تری آنکھوں سے — کیا مروت بھی گئی خوابِ سحر کی صورت

جوش زن بحر محبت تھا مگر دل اپنا — صاف نکلا نگہِ دیدۂ تر کی صورت

لطف جب آتا ہے اقبال سخن گوئی کا
شعر نکلے صدفِ دل سے گہر کی صورت

زندگی دنیا کی مرگ ناگہان اہل درد — موت پیغام حیات جاودانِ اہل درد

بند ہو کر اور کھلتی ہے زبانِ اہل درد — بولتا ہے شل نَے ہر استخوانِ اہل درد

آپ بائع آپ ہی نقد و متاع و مشتری — ساری دنیا سے نرالی ہے دکانِ اہل درد

اس خموشی اور گویائی کے صدقے جایئے — محو شکر بے زبانی ہے زبانِ اہل درد

بیخودی میں پہنچ جاتے ہیں اپنے آپ تک — عین بیداری نہ ہو خواب گرانِ اہل درد

کہہ رہی ہے ہر کلی گلزار ابراہیم کی — آگ سے ہوتا ہے پیدا گلستان اہل درد

پالیا موسیٰ نے آخر بندۂ اللہ کو — درد والوں ہی کو ملتا ہے نشان اہل درد

ان کی دنیا بھی یہی عرش معلیٰ بھی یہی — دل مکان اہل درد ولا مکان اہل درد

ہائے کیا محشر پہ واعظ نے اٹھا رکھی ہے بات — ہے اسی دنیا میں ہوتا امتحان اہل درد

درد ہی کے دم سے ہے ان دل جلوں کی زندگی — درد سے پیدا ہوئی روح روان اہل درد

یہ اجڑ جانے کو آبادی سمجھتے ہیں مگر — ڈھونڈتا ہے راہزن کو کاروان اہل درد

از نجا لاہم نے اے اقبال کہہ ڈالے یہ شعر
تھی نوازش کو جو فکر امتحان اہل درد

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر — وہ بزم یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

جو تیرے کوچے کے ساکنوں کا فضائے جنت میں دل نہ بہلا — تسلیاں دے رہی ہیں حوریں خوشامدوں سے منا منا کر

بہار جنت کو کھینچتا تھا ہمیں مدینے سے آج رضوان — ہزار مشکل سے اسکو ٹالا بڑے بہانے بنا بنا کر

لحد میں سوتے ہیں تیرے شیدا تو حور جنت کو اس پہ کیا ہے — کہ شور محشر کو بھیجتی ہے خبر نہیں کیا سکھا سکھا کر

تری جدائی میں خاک ہونا اثر دکھاتا ہے کیمیا کا — دیار یثرب میں آ ہی پہنچے صبا کی موجوں میں مل ملا کر

شہید عشق نبی کے مرنے میں بانکپن بھی ہیں سو طرح کے — اجل بھی کہتی ہے زندہ باشی ہمارے مرنے پہ زہر کھا کر

رکی ہوئی کام آ ہی جاتی ہے جنس عصیاں عجیب شے ہے — کوئی اسے پوچھتا پھرے ہے زر شفاعت دکھا دکھا کر

ترے ثنا گو عروسِ رحمت سے چھیڑ کرتے ہیں روزِ محشر — کہ اس کو پیچھے لگا لیا ہے گناہ اپنے دکھا دکھا کر
کرے کوئی کیا کہ تاڑ لیتی ہے لاکھ پردوں میں بھی شفاعت — رکھے تھے ہم نے گناہ اپنے ترے غضب سے چھپا چھپا کر
بتائے دیتے ہیں اے صبا ہم یہ گلستانِ عرب کی بو ہے — مگر نہ اب ہاتھ لا ادھر کو وہیں سے لائی ہے تو اڑا کر
تری جدائی میں مرنے والے فنا کے تیروں سے بے خطر ہیں — اجل کی ہم نے ہنسی اڑائی اسے بھی مارا تھکا تھکا کر
ہنسی بھی کچھ کچھ نکل رہی ہے مجھے بھی محشر میں تاکتی ہے — کہیں شفاعت نہ لے گئی ہو مری کتابِ عمل اٹھا کر
یہ پردہ داری تو پردہ در ہے مگر شفاعت کا آسرا ہے — دبک کے محشر میں بیٹھ جاتا ہوں دامنِ تر میں منہ چھپا کر
شہیدِ عشقِ نبی ہوں میری لحد میں شمعِ قمر جلے گی — اٹھا کے لائیں گے خود فرشتے چراغ خورشید سے جلا کر
جسے محبت کا درد کہتے ہیں مایۂ زندگی ہے مجھ کو — یہ درد وہ ہے کہ میں نے رکھا ہے دل میں اسکو چھپا چھپا کر

خیال راہِ عدم سے اقبال تیرے در پر ہوا ہے حاضر
بغل میں زادِ عمل نہیں ہے صلہ مری نعت کا عطا کر

پردہ چہرہ سے اٹھا انجمن آرائی کر — چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
ہو تری خاک کے ہر ذرّے سے تعمیرِ حرم — دل کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر
نفسِ گرم کی تاثیر ہے انعامِ حیات — تیرے سینہ میں اگر ہے تو مسیحائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمکِ پنہاں کیسی — بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر
تا کجا طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیمؑ — اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو بہ اندازۂ رعنائی کر

پہلے خود دار تو مانند سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوس شوکتِ دارائی کر

مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

سکوں ناآشنا رہنا اُسے سامانِ ہستی ہے
تڑپ کس دل کی یارب چھپ کے جا بیٹھی ہے پارے میں

جو ہے بیدار انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو ذوقِ تکلم کی
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، اُفتادگی تیری کنارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں، میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

مرے پہلو میں دل ہے یا کوئی آئینہ جادو کا
تری صورت نظر آئی مجھے اپنے نظارے میں

جو نکلی نالہ بن کر غنچۂ منقارِ بلبل سے
وہی نکہت چمن سے اُڑ کے جا چمکی ستارے میں

نہاں تھا تو تو روشن تھا چراغِ زندگی میرا
گر موجِ نفس پوشیدہ تھی تیرے نظارے میں

اُتارا میں نے زنجیرِ رسومِ اہلِ ظاہر کو
ملا وہ لطفِ آزادی مجھے تیرے سہارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی — مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں

نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں — نہ وہ غزنوی میں مذاق ہے نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ — جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

تجھے کیا بتاؤں میں ہمنشیں مجھے موت میں جو مزا ملا — نہ ملا مسیح و خضر کو بھی وہ نشاط عمر دراز میں

کوئی جا کے مسلم خستہ جاں کو سنائے میرا پیام یہ
جو وطن ہے دشمنِ آبرو تو اماں ہے ملک حجاز میں

سختیاں کرتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں — ہائے کیا اچھا کیا ظالم ہوں میں جاہل ہوں میں

میں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی — جو نمودِ حق سے مٹ جاتا ہے وہ باطل ہوں میں

اے تماشائی مری پستی کا نظّارہ تو دیکھ — اسفلِ عالی نظر ہوں ناقصِ کامل ہوں میں

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست — وائے محرومی خزف چینِ لب ساحل ہوں میں

تم نے تاکا دل کو لیکن اُف رے شوقِ تیرِ عشق — دل سے کہتا ہے جگر تو دل نہیں ہے دل ہوں میں

ہے مری ذلّت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل — جس کی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں

تجھ میں پوشیدہ ہے لیلیٰ اور ہے لیلیٰ کوئی — کہہ رہا ہے دل ترا لیلیٰ نہیں محمل ہوں میں

کشتِ آزادی کی بجلی تھی مری تقلید ہی — پھونک ڈالی اپنی کھیتی آہ کیا غافل ہوں میں

میں وہی ہوں کھو گیا تھا جس کا دل روزِ الست — اب نہ پہچانو تو تم جانو وہی بے دل ہوں میں

ہے عبث اے برق تجھ کو میرے حاصل کی تلاش — مجھ پہ آ کر گر کہ اپنا آپ ہی حاصل ہوں میں

بزمِ ہستی اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو — تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

جانتا ہے جلوۂ بے پردہ ہے کاشانہ سوز — سادگی دیکھو کہ پھر دیدار کا سائل ہوں میں

تخم ریزی جس کی ہنگامِ صدائے کن ہوئی — اس پرانی مزرعِ زرخیز کا حاصل ہوں میں

ڈھونڈتا پھرتا ہے کیا اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

جنہیں ڈھونڈا تھا میں نے آسمانوں میں زمینوں میں — وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

میں تاریکی ہوں لیکن مجھ میں پوشیدہ وہ گوہر ہے — جھلک جس کی عیاں ہے اے فلک تیرے نگینوں میں

حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی — مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

اگر کچھ آشنا ہوتا مذاقِ جبہہ سائی کا — تو سنگِ آستانِ کعبہ جا ملتا جبینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں — کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں — مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے ۔ کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے ۔ وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس ان کی ۔ الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی ۔ نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو ۔ ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

ترستی ہے نگاہ نارسا جس کے نظارے کو ۔ وہ رونق انجمن کی ہے انہیں خلوت گزینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمن دل کو ۔ کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا ۔ یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق ۔ بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر ۔ ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

کہیں لیلیٰ نے شاید دیکھ پائی ہے جھلک تیری ۔ کہ محمل سے نکل کر جا ملی صحرا نشینوں میں

نمایاں ہو کے دکھلائے کبھی ان کو جمال اپنا ۔ بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں

میں اے خضر محبت ڈھونڈتا ہوں اس ولایت کو ۔ جہاں سبزے کی صورت طور اگتے ہیں زمینوں میں

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا ۔ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

برا سمجھوں انہیں مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا ۔ کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں — یہ عاشق کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں — جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

بیابانوں میں لے دل اہل دِل کی جستجو کیسی — کریں جو پیار انساں سے وہی اللہ والے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا — جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

غضب کے منچلے ہیں جنس دل کے بیچنے والے — یہ میرے مال کے ساتھ آپ بھی بک جانے والے ہیں

رُلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی — نرالا عشق ہے میرا نرالے میرے نالے ہیں

نشیمن یوں تو بتاتے ہیں وہ سب کو لامکاں اپنا — ہمیں معلوم ہے اے دل جہاں کے رہنے والے ہیں

پلا دی اس کو کیا مَے ساقیٔ بادِ بہاری نے — زبانِ برگِ گل پر قطرۂ شبنم کے چھالے ہیں

نہ دیکھ اے دیدۂ خوں بار دل کو کم لگا ہی ہے — ترے آنسو اسی اُجڑے ہوئے گلشن کے لالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذّت خانماں برباد رہنے کی — نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہِ منزل سے — ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

دعا دیتا ہوں روتا ہوں گلہ کرتا ہوں قسمت کا — ہزاروں ڈھنگ اظہارِ تمنا کے نکالے ہیں

الٰہی کونسا مالی ہے اس دل کے گلستاں کا — امیدوں کے شجر زخموں کے گل داغوں کے لالے ہیں

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو — یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

نہیں کچھ امتیاز ما و تو شہرِ محبت میں — نرالا دیس ہے دستور ہی یاں کے نرالے ہیں

نشانِ ماہِ کنعاں اے زلیخا پوچھ لے مجھ سے — کہ میں نے چاہِ دل سے سیکڑوں یوسف نکالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو

کہ اک ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں — مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا — وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی — کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو — کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

مری جاں نہیں ربط غیروں سے اچھا — بھلا میں تمھارا برا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل — چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی — بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

مجھے جلوۂ گل ہے برقِ تجلّی — سنبھالو مجھے میں گرا چاہتا ہوں

نہ کوثر کا خواہاں نہ حوروں کا شیدا — خدا جانے میں کیا ہوں کیا چاہتا ہوں

اُگوں سبز ہوں پس کے ہو خون آخر — میں قسمت مثالِ حنا چاہتا ہوں

شجر ہوں گری مجھ پہ برقِ محبت — ہرا ہو گیا ہوں پھلا چاہتا ہوں

مری جاں تری بے حجابی سے پہلے — تری دید کا حوصلہ چاہتا ہوں

محبت مٹا دے گی بیگانگی کو ۔ سنبھل بیٹھ میں تو ہوا چاہتا ہوں
ہوا خاک میں لے ہوائے محبت ۔ مدینے کی جانب اُڑا چاہتا ہوں

چلوں کے اقبال کے گھر کو ڈھونڈھیں
کہیں بھی اُسے دیکھنا چاہتا ہوں

بلا کشانِ محبت کی یادگار ہوں میں ۔ مٹا ہوا خطِ لوحِ سرِ مزار ہوں میں
فنا ہوئے پہ بھی گو یادِ فا شعار ہوں میں ۔ جو مٹ گیا تو حسینوں کا اعتبار ہوں میں
نشہ میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ ۔ وہ اپنا وعظ کہے جائے ہوشیار ہوں میں
تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ ۔ کہا جو سر کو جھکا کر گناہگار ہوں میں

رہی نہ زہر میں اقبال وہ پرانی بات
کسی کے ہجر میں جینے سے شرمسار ہوں میں

محبت کو دولت بڑی جانتے ہیں ۔ اسے مایۂ زندگی جانتے ہیں
نرالے ہیں انداز دنیا سے اپنے ۔ کہ تقلید کو خودکشی جانتے ہیں
کوئی قید سمجھے مگر ہم تو اے دل ۔ محبت کو آزادگی جانتے ہیں
حسینوں میں ہیں کچھ وہی ہوش والے ۔ کہ جو حسن کو عارضی جانتے ہیں
جو ہے گلشنِ طُور اے دل تجھے ہم ۔ اُسی باغ کی اک کلی جانتے ہیں

ہے کلیجا دگار ہونے کو - دامن لالہ زار ہونے کو

عشق وہ چیز ہے کہ جس میں قرار - چاہیئے بے قرار ہونے کو

جستجوئے قفس ہے میرے لئے - خوب سمجھے شکار ہونے کو

پیس ڈالا ہے آسماں نے مجھے - کس کی رہ کا غبار ہونے کو

کیا ادائیں وہ جاں نثاری ہیں - تھے وہ مجھ پر نثار ہونے کو

زخم اور سوزن رفو توبہ - کھل گیا بے تکار ہونے کو

وعدہ کرتے ہوئے نہ رک جاؤ - ہے مجھے اعتبار ہونے کو

اُس نے پوچھا کہ کون چھپتا ہے - ہم چھپے آشکار ہونے کو

ہم نے اقبال عشق بازی کی
پی یہ مے ہوشیار ہونے کو

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی - ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لب گویا پیام موت - اب کیا کسی کے عشق کا دعوےٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر - ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن - دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

عذر آفرین جرم محبت ہے حسن دوست - محشر میں اور عذر نہ پیدا کرے کوئی

چھپتی نہیں ہے یہ نگہِ شوق ہمنشیں ۔۔۔ پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی

اُڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیمؑ ۔۔۔ طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

سو سو اُمید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر ۔۔۔ مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

دے کر جھلک سی آپ تو پردے میں ہو رہے ۔۔۔ اور کہہ گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی

نظارہ کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے ۔۔۔ نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

محفل ہو شغلِ مے ہو شبِ ماہتاب ہو ۔۔۔ اور میں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی

بولے بھی سن کے قصۂ ہجراں تو یہ کہا ۔۔۔ کی دل لگی تو یہ بھی گوارا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں ۔۔۔ دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

اقبال عشق نے مرے سب بل دیے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں میں نے ۔۔۔ ہر ایک چیز میں دیکھا اُسے مکیں میں نے

سوالِ دید میں لذت ہے اے کلیمؑ ایسی ۔۔۔ ہزار بار سنی ہے وہی نہیں میں نے

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے ۔۔۔ بھلایا قصۂ پیمانِ اولیں میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں ۔۔۔ پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو ۔۔۔ دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

ملا مزاجِ تغیر پسند کچھ ایسا - کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
نکالا کعبہ سے پتھر کی مورتوں کو کبھی - کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا - چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کبھی صلیب پر اپنوں نے مجھ کو لٹکایا - کیا فلک کا سفر چھوڑ کر زمیں میں نے
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں - دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
کبھی میں قتل ہوا کربلا کے میداں میں - کہی کسی کو ستم پر بھی آفریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربانی - پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی - بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم - خلافِ معنیِ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے
اٹھائے تلخیِ افکار میں مزے کیا کیا - بنا کے ایک زمانہ کو نکتہ چیں میں نے
لہو سے لال کیا سیکڑوں زمینوں کو - جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی - اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں - سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر - لگا کے آئینۂ عقل دوربیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو — بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ رازِ ہستی کی — کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر — تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

عجیب طرز ہے کچھ گفتگوئے واعظ کا — خدا بچائے یہ باتیں سنی نہیں میں نے

وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی — سنی ضرور ہے دیکھی نہیں کہیں میں نے

نہ توڑ میرے دلِ دردمند کو ظالم — بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگیں میں نے

خدا تو ملتا ہے انساں ہی نہیں ملتا — یہ چیز وہ ہے کہ دیکھی کہیں کہیں میں نے

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبال

میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

کوئی یوں گیا ہے ادھر سے نکل کر — قیامت تھی بجلی تھی رفتار کیا تھی

نہ چھوڑا کبھی بے وفائی نے تم کو — مری طرح یہ بھی وفادار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد — مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰ — کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی

ہزاروں کلیجے کو تھامے ہوئے ہیں — الٰہی وہ چشمِ فسوں کار کیا تھی

لیا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں — کرامت تھی شرمِ گنہگار کیا تھی

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے — نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے

اثرِ غضب کا دعائے قدح میں ہے ساقی — کوئی اسے بھی ذرا داخلِ نماز کرے

جواب ثنا ہے لولاک ما عرفنا کا — کوئی جو عجز کے دامن کو یاں دراز کرے

بُرائے کفر کو تازہ کروں یہ کہہ کہہ کر — مدینہ وہ ہے کہ کعبہ جدھر نماز کرے

شعاعِ نور کو تاریکیٔ جہاں میں نہ ڈھونڈ — یہی ہے شمع اگر دل کو تو گداز کرے

تمیزِ لالہ و گل سے ہے نالۂ بلبل — جہاں میں وا نہ کوئی چشمِ امتیاز کرے

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو — کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ — خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی — جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا — جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے — جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

نہیں ہے فرق محبت میں اور غلامی میں — یہ عشق وہ ہے کہ محمود کو ایاز کرے

سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے — یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبال
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ عاشق سے سبک گام خرام
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے ہندوئے صنم خانۂ ایام ابھی

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی

عذر پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

ابرِ نیساں! یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک
میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

جلوۂ گل کا ہے اک دامِ نمایاں بلبل
اس گلستاں میں ہیں پوشیدہ کئی دام ابھی

ہم نوا لذتِ آزادیٔ پرواز کجا
بے پری سے ہے نشیمن بھی مجھے دام ابھی

بادہ گردانِ عجم وہ عربی میری شراب
میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

مانندِ خامہ تیری زباں پر ہے حرفِ غیر
بیگانہ شے پہ نازشِ بیجا بھی چھوڑ دے

لطفِ کلام کیا جو نہ ہو دل میں زخمِ عشق
بسمل نہیں ہے تو تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

شبنم کی طرح پھولوں پہ رو اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
بت خانہ بھی حرم بھی کلیسا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عشق
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

شوخی سی ہے سوالِ مکرر میں اے کلیمؑ
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

ہاں اے شرابِ عشق یہ دن ہیں نمود کے
ایسی اچھل کہ خلوتِ مینا بھی چھوڑ دے

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم
بن کر خیالِ غیر ترے دل میں آئیں ہم

اچھی کہی شکایتِ جور و جفا کی بھی
اتنی سی بات کیلئے محشر میں جائیں ہم

اے صدمۂ فراق نہ کر ہم سے چھیڑ چھاڑ
تو کس کا ناز ہے کہ تجھے بھی اٹھائیں ہم

پوچھیں گے آج سرمۂ دنبالہ دار سے ۔ کس طرح سے کسی کی نظر میں سمائیں ہم

ہر چند منع تو نے ہمیں اے طبیبِ عشق
لیکن بڑھے جو ضعف تو غش بھی نہ کھائیں ہم

کیونکر نہ وہ جہان کو پیغام بزم راز دے ۔ غم کی صدائے دلنشیں جس کا شکستہ ساز دے
قسمت سے ہو گیا ہے تو ذوقِ تپش سے آشنا ۔ پروانہ وار بزم کو تعلیم سوز و ساز دے
اس عشق خانہ ساز کا شانِ کرم پہ ہے مدار ۔ یاں قید کفر و دیں نہیں جس کو وہ بے نیاز دے
غافل تجھے خبر نہیں لذتِ فراغ میں ہے کیا ۔ دنیا ادا پہ کر فدا عقبیٰ بہائے ناز دے
مانندِ شمع نور کا ملتا نہیں لباس اُسے ۔ جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جاں گداز دے
بکتا نہیں جہان میں ارزاں متاعِ کافری ۔ قیمت میں اس کی خرقہ دے تسبیح دے نماز دے
پابند یک صنم نہ ہو ہر لحظہ تو نیاز رہ ۔ پوجا گر اس وثن سے تو پیرہن نماز دے
تارے میں وہ قمر میں وہ بجلی میں وہ شفق میں وہ ۔ چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے
رفعت ہے عجز میں نہاں یعنی نیاز کر شعار ۔ وہ محوِ ناز ہے اگر تو بھی جواب ناز دے
ہو شوقِ سیرِ گل اگر ایسا چمن تلاش کر ۔ ہر غنچے کی چٹک جہاں لطفِ نوائے راز دے
محفل جو تھی بدل گئی ساقی تجھے خبر بھی ہے ۔ اب نہ خدا کے واسطے اِن کو مئے مجاز دے
پیرِ مغانِ فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر ۔ اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

متفرقات

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کے لئے
بجلیاں بیتاب ہوں جن کو جلانے کے لئے

دیکھ لیتا ہوں جہاں تنکا کوئی چھپتا ہوا
ہیں اُٹھا لیتا ہوں اپنے آشیانے کے لئے

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چُن کے تو
آہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کے لئے

اس چمن میں مرغ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لئے

حباب آسا سر موجِ نفس باندھا ہے محمل کو
ذرا دیکھ لے شرر ذوق فنا مجھ کو کہاں تک ہے

وہی اک شعلہ ہے تربت بھی ہے اور شمع تربت بھی
فرا مرنے کا کچھ پروانہ آتش بجاں تک ہے

چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندئی رسم فغاں تک ہے

جوانی ہے تو ذوقِ آرزو بھی لطف ارماں بھی
ہمارے گھر کی آبادی قیام میہماں تک ہے

اے حبابِ بحر اے پروردۂ دامانِ موج
کچھ پتہ ملتا ہے تجھ سے اپنی ہستی کا مجھے

کھل گئی چشم تماشا اپنی جس دم اے کلیم
طُور ہر ذرے کے دامن میں نظر آیا مجھے

موت یہ میری نہیں میری اجل کی موت ہے
کیوں ڈروں اس سے کہ مر کر پھر نہیں مرنا مجھے

کہتا ہے خضر دشتِ جنوں میں مجھے کہ چل
آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹے نکال کے

یوں تو اے صیاد آزادی میں ہیں لاکھوں مزے
دام کے نیچے پھڑکنے کا تماشا اور ہے

کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

تعلق پھول ہیں گویا ریاضِ آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

تہِ دام بھی غزل آشنا ہے طائرانِ چمن تو کیا
جو فغاں دلوں میں تڑپ رہی تھی نوائے زیرِ لبی رہی

ترا جلوہ کچھ بھی تسلیٔ دلِ ناصبور نہ کر سکا
وہی گریۂ سحری رہا وہی آہِ نیم شبی رہی

نہ خدا رہا نہ حرم رہا نہ رقیب دیر و حرم رہے
نہ رہی کہیں اسد اللہی نہ کہیں وہ بولہبی رہی

مرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخمہائے عجم رہا
میں وہ ہوں شہیدِ وفا مگر کہ نوا مری عربی رہی

۷۸۶

نکات

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی ۱ کم زور کی کمند ہے دنیا میں نارسا
نازک یہ سلطنت صفتِ برگِ گُل نہیں لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا
گاڑھا اودھر ہے زیبِ بدن اور زرہ اُدھر صرصر کی رہ گزار میں کیا عرض توتیا
پس کر ملے گا گردِ رہِ روزگار میں دانہ جو آسیا سے ہوا قوت آزما
بولا یہ بات سُن کے کمال وقار سے وہ مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا
خارا حریفِ سعیٔ ضعیفاں نمی شود صد کوچہ است در بنِ دنداں خلال را

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

آپ نے خدمت کی ہے خلق اللہ کی ۲ دن بکھیڑے ہوتے ہیں کب سرمالوی
مسلمِ ناداں کو کیا معلوم ہے کس خدا کے ہیں پیمبر مالوی
خوب تھا یہ خالصہ جی کا بچن کب ہے گاندھی کے برابر مالوی
مرد میداں گاندھی درویش خو اور کونسل کے سپیکر مالوی

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے ۳ ماجرا اپنی ناتمامی کا

مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو — صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوہ دار بے زحمت — پی گیا سب لہو اسامی کا

یہ آیۂ نو جیل سے نازل ہوئی مجھ پر ۴ گیتا میں ہے قرآن تو قرآن میں گیتا
کیا خوب ہوئی آشتی شیخ و برہمن — اس جنگ میں آخر نہ یہ ہارا نہ وہ جیتا
مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے "بدری" — مسجد سے نکلتا نہیں ضدی ہے "مسیتا"

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے ۵ واں جام بلوریں ہیں سارے یاں ایک پرانا مٹکا ہے
اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائے گا — جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں — گردوں نے کتنی بلندی سے اِن قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے دستور محبت قائم تھا — یا بحث میں اردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

پٹی خوب جمن کے ہاتھوں نصیبن ۶ گئی عرس میں اور شب بھر نہ آئی
نہیں بار صاحب کے ٹیبل پہ اس کو — پڑی روپ بسکٹ کا دھارے نخطائی
خدا کی زمیں تھی مزارع نے جوتی — کمائی مگر چودھری جی نے کھائی

جانِ جائے ہاتھ سے جائے نہ ست ۷ ہے یہی اک بات ہر مذہب کا تت
چٹّے بٹّے ایک ہی تھیلی کے ہیں ساہو کاری بسوہ داری سلطنت

عمل عاشقوں کے ہیں بے طور سارے ۸ نہیں اس کمیٹی کا کوئی اجنڈا
تمہیں ہند سرمایہ دار و مُبارک سلامت رہے مجھ کو فیجی۔ یوگنڈا
میں ڈنڈے پہ تھا گر تو انڈے پہ راضی میرا پیر ڈنڈا ترا پیر انڈا

مشرق میں اُصولِ دین بن جاتے ہیں ۹ مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلّے واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ۱۰ ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدّنظر وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردہ کے کوئی حامی نہیں ۱۱ مفت میں کالج کے لڑکے اِن سے بدظن ہو گئے

وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف　　پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوشمند　۱۲　غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض　　کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہے گی

انساں ہوئے مہذب لیکن مزا تو جب ہے　۱۲　جنگل میں کہہ رہی تھی ہاتھی سے کل یہ ہتنی
تقریر کو کھڑی ہو کلو میاں کی بیوی　　پردھان ہو سبھا میں کی دھرم پتنی

ہر محکمے میں عہدے تقسیم ہوں برابر　۱۲　ہوتی نہیں ہے ہم کو جنگ و جدل سے سیری
خفیہ پولس میں جب بے حد ہو گئی ہے قائم　　ہندو وہاں ہیڈ افسر مسلم وہاں آنریری

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں　۱۵　پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ
سنتے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط　　آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ
میرا یہ حال بوٹ کی ٹو چاٹتا ہوں میں　　ان کا یہ حکم دیکھ مرے فرش پر نہ رینگ
کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدا سا جانور　　اچھی ہے گائے رکھتی ہے کیا نوکدار سینگ

کہی اچھی نقیب انجمن نے ۱۶ وہ سمجھے گا اسے جو کاردان ہے
خدا واحد ہے۔ دو ناظم ہیں اپنے دو عملے میں ہمارا آشیان ہے

جنابِ شیخ کو پلواؤ خاص لندن کی ۱۷ عجیب نسخہ ہے یہ خود فراموشی کے لئے
ہمارے حق میں تو جینا بتر ہے مرنے سے جو زندہ ہیں تو فقط آپ کی خوشی کے لئے
ہوا میں جینے سے بیزار جب تو فرمایا کہاں سے لاؤگے بندوق خودکشی کے لئے

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ ۱۸ دفعِ مرض کے واسطے پِل پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ اُستاد کے عوض دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک ۱۹ چھتریاں۔ رومال۔ مفلر۔ پیرہن جاپان سے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی آئیں گے غسال کابل سے کفن جاپان سے

سُنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں ۲۰ پُرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاروں کا

مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا — کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

---

٢١ محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے — دیکھیے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون
حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیز — ٹل نہیں سکتا وَقَدْ کُنْتُمْ بِہٖ تَسْتَعْجِلُوْن
کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام — چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ یَنْسِلُوْن

---

٢٢ کارخانہ کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار — عیش کا پتلا ہے محنت ہے اُسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی — کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

---

٢٣ بختِ مسلم کی شبِ تار سے ڈرتی ہے سحر — تیرگی میں ہے یہ شب دیدۂ آہو کی طرح
ہے اندھیرے میں فقط مولوی صاحب کی نمود — بن کے شمس العلما چمکے ہیں جگنو کی طرح

---

٢٤ دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تلک — شیشۂ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشترِ تعلیمِ جدید — میرا سرجن رگِ ملت سے لہو لیتا ہے

---

۲۵ ملا کا محتسب کا خدا کا نبی کا ڈر
دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانے میں
مضمون نگار بیوی کا سی آئی ڈی کا ڈر
دو خوف رہ گئے ہیں ہمارے زمانے میں

---

۲۶ تہذیب کے تو سامنے سر اپنا خم کریں
کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگدست
تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں
ردّ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا لیا

---

۲۷ رکھ کے میخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق
شام کی سرحد سے رخصت ہے وہ رندِ لم یزل
رنگ اک پل میں بدل جاتا ہے یہ نیلی رواق
یہ اگر سچ ہے تو ہے کس درجہ عبرت کا مقام
حکم برداری کے معدے میں ہے درد لا یطاق
حضرتِ کرزن کو اب فکر مداوا ہے ضرور
کیا یہ چورن ہے پئے ہضمِ فلسطین و عراق
وفد ہندوستان سے کرتے ہیں سر آغا خاں طلب

---

۲۸ ہم کو نہیں ہے مذہبِ اسلام سے عناد
اخبار میں یہ لکھتا ہے لندن کا پادری
کرتے ہیں ارمنوں پہ جو ترکانِ بد نہاد
لیکن وہ ظلم ننگ ہے تہذیب کے لئے
مٹ جائے تا جہاں سے بنائے شر و فساد
مسلم بھی ہوں حمایتِ حق میں ہمارے ساتھ
بلّی چوہے کو دیتی ہے پیغامِ اتحاد
سن کر یہ بات خوب کہا شہنواز نے

لندن کے چرخ نادرہ فن سے پہاڑ پر ۲۹ اُترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی تباہیاں اے جانِ برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیالِ دشت و بیاباں نکال دے مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب اِس دین میں ہے ترکِ سوادِ حرم مباح
بُشریٰ لکم کہ منتظر ما رسیدہ است یعنی حجابِ غیبتِ کبریٰ رسیدہ است

دل شمع صفت عشق سے ہو نور سراپا ۳۰ اور فکر یہ روشن ہو کہ آئینہ ہو گویا
نیکی ہو ہر اک فعل میں نیت کی ہویدا ہر حال میں ہو خالقِ ہستی پہ بھروسا
ایسی کوئی نعمت تہِ افلاک نہیں ہے یہ بات جو حاصل ہو تو کچھ باک نہیں ہے

ہند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرنگ ۳۱ دل گراں۔ ہمت سبک۔ ووٹر فزوں۔ روزی تنک
بے ٹکٹ بے پاس بھارت کی سیاسی ریل میں ہو گیا آخر مسیتا بھی مع اسباب بک
"لک ودن" کا حکم تھا اس بندۂ اللہ کو اب یہ سنتے ہیں نکلنے کو ہے مسلم "اوٹ لک"
کیا عجب پہلے ہی لیڈر ہیں یہ کر دے آشکار کس طرح "آیا" کو لے کر اڑ گیا صاحب کا "کک"
ختم تھا مرحوم اکبر پر ہی یہ رنگِ سخن ہر سخنور کی یہاں طبعِ رواں جاتی ہے رُک

قافیہ اک اور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں — کر دیا متروک دِلّی کے زباں دانوں نے ٹک

ہر ذرۂ چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ ۳۲ غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے

سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم — تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے ۳۳ دل اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

کیا خوب امیرِ فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا — تو چمڑے کا تو حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں — جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے — گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

اٹھا کر پھینک دو ڈربے سے باہر ۳۴ نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

الکشن ممبری کونسل وزارت — بنائے خوب آزادی نے پھندے

میاں نجّار بھی چھیلے گئے ساتھ — نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے ۳۵ مگر آج ہے وقت خود آزمائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا　　خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی
مرا از شکستن چناں عار ناید　　کہ از دیگراں خواستن مومیائی

۳۶

گرچہ تو زندانیِ اسباب ہے　　قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں　　عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر　　آیۂ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد رکھ
یہ لسان العصر کا پیغام ہے　　اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ یاد رکھ

۷۸۶

شام

مصرِ ہستی میں شام آتی ہے — رنگ اپنا جمائے جاتی ہے

اے سبوئے مئے شفق اے شام — تو مئے بے خودی پلاتی ہے

سرمۂ دیدۂ اُفق بن کر — چشمِ ہستی میں تو سماتی ہے

کس خموشی سے اُڑ رہے ہیں طیور — تو رہِ آشیاں دکھاتی ہے

ریزشِ دانہ ہائے اختر کو — مزرعِ آسماں میں آتی ہے

تو پرِ طیرِ آشیاں رو کو — چشمِ صیاد سے چھپاتی ہے

صبح در آستیں ہے تو شاید — آنکھ اختر کی کھلتی جاتی ہے

تو پیامِ وفاتِ بیداری — محفلِ زندگی میں لاتی ہے

اپنے دامن میں بہر غنچۂ گل — خواب لیکر چمن میں آتی ہے

خامشی زا ہے تیرا نظّارا — آہ یہہ حُسن انجمن آرا

کوہستانِ ہمالہ

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ پہ کچھ ظاہر نہیں دیرینہ روزی کے نشاں تو جواں ہے دورۂ شام و سحر کے درمیاں

تیری ہستی پر نہیں بادِ تغیّر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایام پر

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو مطلعِ اول فلک جس کا ہو وہ درباں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

سلسلہ تیرا ہے یا بحرِ بلندی موج زن رقص کرتی ہے مزہ سے جس پہ سورج کی کرن
تیری ہر چوٹی کا دامانِ فلک میں ہے وطن چشمۂ دامن میں رہتی ہے مگر پرتو فگن

چشمۂ دامن ہے یا آئینۂ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے تازیانہ دیدیا برقِ سرِ کہسار نے

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کیلئے

ہائے کیا جوش مسرت میں اُڑا جاتا ہے ابر

فیل بے زنجیر کی صورت چلا جاتا ہے ابر

جنبش موجِ نسیم صبح گہوارہ بنی جھومتی ہے کیا مزے لے لے کے ہر گُل کی کلی

یوں زبانِ برگ سے کہتی ہے اس کی خامشی دستِ گل چیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہے افسانہ مرا

کنج قدرت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

نہر چلتی ہے سرود خامشی گاتی ہوئی آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی

کوثر و تسنیم کی مانند لہر آتی ہوئی ناز کرتی ہے فرازِ راہ سے جاتی ہوئی

چھیڑتا جا اس عراق دلنشیں کے ساز کو

اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیِ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر

خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

وہ اچھالی پنجۂ قدرت نے گنبد اک نور کی   جھانکتا ہے وہ درختوں کے پرے خورشید بھی

دل لگی کرتی ہے ہر پتے سے جس کی روشنی   میرے کانوں میں صدا آئی مگر کچھ دور کی

دل کی تاریکی میں وہ خورشید جاں افروز ہے

شمعِ ہستی جس کی کرنوں سے ضیا اندوز ہے

وہ اُصولِ حق نمائے نقشِ ہستی کی صدا   روح کو ملتی ہے جس سے لذتِ آبِ بقا

جس سے پردہ روئے قانونِ محبت کا اٹھا   جس نے انساں کو دیا رازِ حقیقت کا پتا

تیرے دامن کی ہوا میں سے اُگا تھا یہ شجر

بیج جس کی ہند میں ہے چین و جاپاں میں ثمر

تو تو ہے مدت سے اپنی سرزمیں کا آشنا   کچھ بتا اُن رازدانانِ حقیقت کا پتا

تیری خاموشی میں ہے عہدِ سلف کا ماجرا   تیرے ہر ذرے میں ہے کوہِ الپس کی فضا

ایک جلوہ تھا کلیمِ طُورِ سینا کے لئے

تو تجلی ہے سراسر چشمِ بینا کے لئے

اے ہمالہ داستاں اُس وقت کی کوئی سنا   مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا

کچھ بتا اس سیدھی سادھی زندگی کا ماجرا   داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

آنکھ اے دل کھول اور نظارۂ قدرت کو دیکھ
اس فضا کو اس گل و گلزار کی رنگت کو دیکھ

اپنی پستی دیکھ اور اس کوہ کی رفعت کو دیکھ
اس خموشی میں سرورِ گوشۂ عزلت کو دیکھ

شاہدِ مطلب ملے جس سے وہ ساماں ہے یہی
دردِ دل جاتا رہے جس سے وہ درماں ہے یہی

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محو سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

پیامِ سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شرابِ سرخ سے رنگین ہوا ہے دامنِ شام
لئے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام

عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منارِ خواب گہِ شہسوارِ چغتائی

فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل

کوئی زمان سلف کی کتاب ہے یہ محل

نظارہ موج کو پھر وجہ اضطراب ہے کیا — یہ کہنہ مشق نو آموز پیچ و تاب ہے کیا
مقام کیا ہے سرود خموش ہے گویا — شجر یہ انجمن بے خروش ہے گویا

نماز شام کی خاطر یہ اہل دل ہیں کھڑے
مری نگاہ میں انسان پا بگل ہیں کھڑے

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز — ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرم ستیز
سبک روی میں ہے مثل نگاہ یہ کشتی — نکل کے حلقۂ حد نظر سے دور گئی
جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہی — ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

طفل شیرخوار

میں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلاتا ہے تو — مہرباں ہوں میں گر نامہرباں سمجھا ہے تو
ایسی چیزوں کو جو تو سمجھا ہے سامان خوشی — کیا کسی دکھ درد کے مکتب کی ابجد ہے یہی
درد سے اے نو اسیر حلقۂ گرداب درد — ہو تو جائیگی تجھے آگاہی اسباب درد

پھر پڑا روئے گا اے نو وارد اقلیم غم
چبھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوکِ قلم

آہ کیوں دکھ دینے والی شئے سے تجھ کو پیار ہے
کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے

اس چمکتی چیز کی خاطر یہ بے تابی ہے کیا
اب سیاہی کے گرانے کی تجھے سوجھی ہے کیا

گیند ہے تیری کہاں چینی کی بلّی ہے کدھر
وہ ذرا سا جانور ٹوٹا ہوا ہے جس کا سر

ہے تجھے کچھ فرش پر اس کو گرانے میں مزا
ٹوٹ جائے آئینہ میرا تجھے پروا ہے کیا

تالیوں کا ہو کوئی گچھا کہ سونے کی گھڑی
مل گئی جو شئے تجھے تیرا کھلونا بن گئی

جو تری آنکھوں کے آگے ہو ہوس انگیز ہے
یعنی ہر شئے توسنِ ادراک کو مہمیز ہے

پھوٹتی ہے فصلِ گُل کی جس طرح پہلے کلی
منہ پہ ڈالے سبز پتے کی نقابِ عارضی

ق

یوں ترے ہنسنے سے دل میں ہے تمنّا کی نمود
اے گلِ نشگفتۂ صحنِ چمن زارِ وجود

ہاتھ کی جنبش میں طرزِ دید ہیں پوشیدہ ہے
تیری صورت آرزو بھی تیری نوزائیدہ ہے

تیرا آئینہ تھا آزادِ غبارِ آرزو
وصلِ ہستی سے چمک اٹھا شرارِ آرزو

زندگانی ہے تری آزادِ قیدِ امتیاز
تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

جب کسی شئے پر بگڑ کر مجھ سے چلاتا ہے تو
کیا تماشا ہے ردی کاغذ سے من جاتا ہے تو

آہ اس عادت میں ہم آہنگ ہوں میں بھی ترا
جلد آ جاتا ہے غصہ جلد من جاتا ہوں میں

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری
کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری

تیری صورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں
دیکھنے کو نوجواں ہوں طفلِ ناداں میں بھی ہوں

چاند

اے قمر کیا خامشی افزا ہے تیری روشنی
رات کے دامن میں ہے گویا سحر سوئی ہوئی

میرے ویرانے سے کوسوں دور ہے تیرا وطن
ہے مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن

حسنِ کامل تیری صورت کا نشاط انگیز ہے
چاندنی میں تیری اک تسکینِ غم آمیز ہے

قصد کس محفل کا ہے آتا ہے کس محفل سے تو
زرد رو شاید ہوا رنجِ رہِ منزل سے تو

گھر بنایا تونے گو ہنگامۂ ہستی سے دور
چاندنی تیری نہیں انسان کی بستی سے دور

ہاں اُتر آ میرے دل میں ساتھ لے کر چاندنی
اس اندھیرے گھر میں بھی چھا جائے دم بھر چاندنی

آفرینش میں سراپا نور تو ظلمت ہوں میں
اس سیہ روزی پہ لیکن تیرا ہم قسمت ہوں میں

آہ میں جلتا ہوں سوزِ اشتیاقِ دید سے
تو سراپا سوز داغِ منتِ خورشید سے

ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردشِ پرکار ہے

زندگی کی رہ میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے سوزاں ہوں میں

میں رہِ منزل میں ہوں تو بھی رہِ منزل میں ہے
تیری محفل میں ہے جو سنسان میرے دل میں ہے

تو طلب خو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا عشق میرا نور ہے

انجمن ہے ایک میری بھی جہاں رہتا ہوں میں
بزم میں اپنی اگر یکتا ہے تو تنہا ہوں میں

مہر کا پرتو ترے حق میں ہے پیغام اجل
محو کر دیتا ہے مجھ کو جلوۂ حُسنِ ازل

پھر بھی اے ماہِ مبیں میں اور ہوں تو اور ہے
یعنی میں صیاد ہوں جس کا وہ آہو اور ہے

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو
سینکڑوں منزل ہے ذوقِ آگہی سے دور تو

جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے
یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

آفتاب

اے آفتاب روحِ روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو

باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شئے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے

ہر شئے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے خرد ہے روحِ رواں ہے شعور ہے

اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستیٔ ہر جاندار میں تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اول و آخر ضیا تری

موجِ دریا

مضطرب رکھتا ہے میرا دلِ بیتاب مجھے عینِ ہستی ہے تڑپ صورتِ سیماب مجھے
موج ہے نام مرا بحر ہے پایاب مجھے ہو نہ زنجیر کبھی حلقۂ گرداب مجھے
آب میں مثلِ ہوا جاتا ہے توسن میرا
خارِ ماہی سے نہ اٹکا کبھی دامن میرا
میں اچھلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمتِ تنگیٔ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

غنچہ آب میں گلشن کی تماشائی ہوں اپنی ہستی کو مٹانے کی تمنائی ہوں
کشتۂ عشق ہوں مجرم ہوں شکیبائی ہوں حوصلہ دیکھ کہ میں بحر کی شیدائی ہوں
زندگی جزو کی ہے کُل میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

ابرِ کہسار

ہے بلندی سے فلک بُوس نشیمن میرا سرِ کہسار پہ دیکھے کوئی جوبن میرا
غیرتِ تختۂ گلزار ہے مسکن میرا کہ گل افشاں ہے سرِ گوشۂ دامن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو
مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُرافشاں ہونا ناقۂ شاہدِ رحمت کا حدی خواں ہونا
غم رُبائے دلِ افسردۂ دہقاں ہونا سبزئ بختِ جوانانِ گلستاں ہونا
بن کے گیسو رُخِ ہستی سے بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں
دور سے دیدۂ اُمید کو ترساتا ہوں جب اُفق پر کبھی چپکے سے چمک جاتا ہوں

سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جو آتا ہوں　　بالیاں نہر کو گرداب کی پہنا تا ہوں

دل لگی کوہ کے چشموں سے مجھے بھاتی ہے

زندگی اپنی اسی طرح گزر جاتی ہے

غنچۂ گل مرے سایہ سے چٹک جاتا ہے　　اخترِ قسمتِ گلزار چمک جاتا ہے

میرا ہر قطرہ گلستاں پہ ٹپک جاتا ہے　　دلِ بلبل کی طرح گل سے اٹک جاتا ہے

سبزۂ مزرعِ نوخیز کی اُمید ہوں میں

زادۂ بحر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے　　اور پرندوں کو کیا محوِ ترنّم میں نے

سر پہ سبزے کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے　　غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسّم میں نے

فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے

جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

ہے مجھے دامنِ کہسار میں سننے کا مزا　　نغمۂ دخترِ دوشیزۂ دہقاں کی صدا

وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اترنا اس کا　　حشر ڈھاتی ہے یہ آہستہ خرامی کی ادا

سر پہ وہ دودھ کی ٹھلیا کو اُٹھالے آنا

اور تھم تھم کے اُترتے ہوئے گاتے آنا

قدم اپنا جو سوئے شہر و دیار اُٹھتا ہے　　شیشۂ خاطر محزوں سے غبار اُٹھتا ہے

کوئی کہتا ہے کہ وہ ابرِ بہار اُٹھتا ہے　　اور کوئی جوشِ طرب میں یہ پکار اُٹھتا ہے

تند و پر شور و سیہ مست ز کہسار آمد

میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

میری عادت میں ہے اک شور مچاتے آنا　　سرِ کہسار سے طنبور بجاتے آنا

چھیڑ سے باغ کی کلیوں کو ہنساتے آنا　　شکوہ ہائے ستمِ مہر سناتے آنا

توسنِ باد پہ اُڑتا ہوا آتا ہوں میں

گرمیٔ مہر کے کشتوں کا مسیحا ہوں میں

اٹھ گیا موجِ ہوا سے کبھی دامن جو ذرا　　ہو گیا عارضِ خاتونِ فلک بے پردا

وہ ضیا گسترِ عالم وہ عروسِ زیبا　　نام انسان کی بولی میں قمر ہے جس کا

نظر آتے ہیں مگر پردہ نشیں چھپتے ہیں

روئے تاباں کی جھلک دے کے حسیں چھپتے ہیں

کی ذرا دست درازی جو ہوا نے مجھ پر　　چاک دامن سے دمکتے نظر آئے اختر

مجھ سے چلنے میں نہ ہوگا کوئی غافل بڑھ کر　　گر پڑے ہیں مرے دامن کی گرہ کھل کے گہر

مقصد ہر صدفِ قلزمِ زخار ہوں میں

ابرِ رحمت ہوں گہر دار گہربار ہوں میں

ہلال عید

اے مہِ عید بے حجاب ہے تو — حسن خورشید کا جواب ہے تو

اے گریبان جامۂ شبِ عید — شاہدِ عیش کا شباب ہے تو

اے نشانِ رکوعِ سورۂ نور — نقشۂ کلکِ انتخاب ہے تو

اے جوابِ خطِ رکوعِ نیاز — طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو

ہائے اے حلقۂ پر طاؤس — قابلِ ذٰلک الکتاب ہے تو

چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا — کہہ دیا خواب کے خواب ہے تو

طوفِ منزل گہِ زمیں کے لئے — ہمہ تن پائے دررکاب ہے تو

یہ ابھرتے ہی آنکھ سے چھپنا — روشنی کا مگر حباب ہے تو

تو کمندِ غزالِ شادی ہے

لذت افزائے شورِ طفلی ہے

۷۸۶
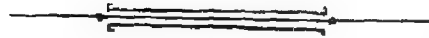
فانوسِ حیات

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بس بھری ہوا نے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ مل کے غیریت کے پردے کو پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے جی کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو
اس ہردوار دل میں لا کر جسے بٹھا دیں

سندر ہو اس کی صورت چھب اس کی موہنی ہو
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہو مرادیں

زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شانِ حرم دکھا دیں

پہلو کو چھیڑ ڈالیں درشن ہو عام اس کا　　ہر آتما کو گویا اک آگ سی لگا دیں
آنکھوں کی ہے جو گنگا لے کے اس سے پانی　　اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں

ہندوستان لکھدیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے　　سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو　　آوازۂ اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں
اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو　　دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ سے جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

سوامی رام تیرتھ

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ نایاب تو　　پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو
آہ کھولا کس ادا سے تو نے راز رنگ و بو　　میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو
مٹ کے غوغا زندگی کا شورش محشر بنا　　یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا
نفیٔ ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا　　لَا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلَّا اللہ کا

چشمِ نابینا سے مخفی معنیٔ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیمِ خام ہے

توڑ دیتا ہے بُتِ ہستی کو ابراہیمِ عشق
ہوش کی دارو ہے گویا مستیٔ تسنیمِ عشق

کیا کہوں زنداں سے ہیں اس شاہدِ مستور کی
دار کو سمجھے ہوئے ہیں جو سرا منصور کی

رام

لب ریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند

یہ ہندیوں کی فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں مَلک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

شکسپیر

شفقِ صبح کو دریا کا خرام آئینہ
نغمۂ شام کو خاموشیٔ شام آئینہ

برگ گُل آئینۂ عارضِ زیبائے بہار — شاہد مے کے لئے حجلۂ جام آئینہ

حُسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن — دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

ہے تری فکرِ فلک رس سے کمالِ ہستی

کیا تری فطرتِ روشن تھی مآلِ ہستی

تجھ کو جب دیدۂ دیدارطلب نے ڈھونڈا — تابِ خورشید کو خورشید میں پنہاں دیکھا

چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تری — اور عالم کو تری آنکھ نے عُریاں دیکھا

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا

راز داں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

غالب

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا — ہے پرِ مُرغِ تصور کی رسائی تا کجا

روح تھا تو اور تھی بزمِ سخن پیکر ترا — زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے

صُورتِ روحِ رواں ہر شئے میں جو مستور ہے

معجزِ کلکِ تصور ہے دیا دیواں ہے یہ — یا کوئی تفسیرِ رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ

نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے تو   نورِ معنی سے دل افروزِ سخن داناں ہے تو

نقش فریادی ہے تیری شوخیٔ تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر   محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر   خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے

گلشنِ ویمر عہ میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہم سری ممکن نہیں   ہو تصور کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سر زمیں   آہ اے نظّارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

شمع یہ جویندۂ دل سوزیٔ پروانہ ہے

اے جہاں آباد اے گہوارۂ علم و ہنر   ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

تیرے ہر ذرّہ میں خوابیدہ ہیں شمس و قمر   یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے

تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

عہ ملک جرمن میں ایک مقام ہے جہاں گوئٹے شاعر مدفون ہے۔

داغ

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں　　مہدیٔ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر　　چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر
آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے　　شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

چل بسا داغ آہ میت اُس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخیٔ طرزِ بیاں　　آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے　　یعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پُوچھے گا سکوتِ گل کا راز　　کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

جوہرِ رنگیں نوائی پا چکا جس دم کمال　　پھر نہ ہو سکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال
کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر　　داغ یعنی وصلِ فکرِ میرزا و دردِ میر
شعر کا کاشانہ لیکن آج پھر ویراں ہوا　　دیدہ خونبار پھر منت کشِ داماں ہوا

بلبل دہلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں — ہم نوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی
آہ دلِ سوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں — اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخیِ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے — یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی — سیکڑوں شاعر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی
اُٹھیں گے آذر ہزاروں شعر کے بت خانے سے — مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت — ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں — تو بھی رو اے خاکِ دلی داغ کو روتا ہوں میں
آہ اے بیت الحرام مذہبِ اہلِ سخن — ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن
وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بُو ہوا — یعنی خالی داغ سے کاشانۂ اُردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں
وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اُٹھ گئے ساقی جو تھے مے خانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا

آرزو کو خون رُلواتی ہے بیدادِ اجل
مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل

کھل نہیں سکتی شکایت کیلئے لیکن زباں
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے سب ہیں اثر
بُوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

ہُمایوں

اے ہمایوں زندگی تیری سراپا سوز تھی
تیری چنگاری چراغ انجمن افروز تھی

گرچہ تھا تیرا تنِ خاکی نزار و دردمند
تھی ستارے کی طرح روشن تری طبعِ بلند

کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد اک مشتِ خاکستر میں تھا

موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

عُرفی

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی

فضائے عشق پر تحریر کی اُس نے نوا ایسی
میسر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنابی

مرے دل نے یہ اک دن اُس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بے تابی

تغیر آگیا ایسا مزاجِ اہلِ عالم میں
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی

فغانِ نیم شب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشمِ محفل آشنائے لطفِ بے خوابی

کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت رُبا کیوں کر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

صدا تربت سے آئی شکوۂ اہلِ جہاں کم کن
"نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"

"حُدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی"

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی

یہ قطعہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھا گیا تھا

کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے
عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز

تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز

جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے — تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز

کبھی ایراں کے لئے ہو جو دعا کا جلسہ — عذر تیرا ہے کہ ہے میری طبیعت ناساز

ختم تقریر تری مدحتِ سرکار پہ ہے — فکر روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز

درِ حکّام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود — پالیسی بھی تری پیچیدہ تر از زلفِ ایاز

اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے — پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز

نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن — اثرِ وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز

دست پرورد ترے ملک کے اخبار بھی ہیں — چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز

اس پہ طُرّہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے — تیرے مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز

جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی — تجھ کو لازم ہے کہ ہو اُٹھ کے شریکِ تگ و تاز

غمِ صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں — پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغِ پرواز

عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشان است — حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

سُن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا — شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز

مجھ میں اوصافِ ضروری تو ہیں موجود مگر — ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی

اور پنجاب میں مِلتا نہیں اُستاد کوئی

زہد اور رندی

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی

شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب ان کا اعالی و ادانی

کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی

لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہ میں کہیں دُردِ خیالِ ہمہ دانی

کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی

دو رند تو فرماتے تھے ہو کر متبسم
دینداروں کی مدح ہے ایماں کی نشانی

مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی

پابندی احکام شریعت میں ہے کیسا
گو شعر میں ہے رشک کلیم ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی

کہتے ہیں کہ ہے اس کو محبت فقرا سے
دیکھی نہیں ہم نے تو کوئی اسکی نشانی

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی

ہر رات اسے راگ کے جلسوں سے سروکار
پھرتا ہے مرے مزرع اوراد پہ پانی

گاتا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے لوث ہے جوں نکہت گل اسکی جوانی

مجموعۂ اضداد ہے اقبال نہیں ہے
دل دفتر حکمت ہے طبیعت خفقانی

رندی سے بھی آگاہ شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی تو منصور کا ثانی

اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تا دیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی

اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سنی اپنے احبّا کی زبانی

اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی

فرمایا شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی

میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہ قرب مکانی

خم ہے سر تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی

گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصور ہمہ دانی

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

ایک پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانا

وہ ساتھ سب کے اڑنا وہ سیر آسماں کی
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا

پتوں کا ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی میں
ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے جانا اپنی خوشی سے آنا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کا صبح آکر پھولوں کا منہ دھلانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

تڑپا رہی ہے مجھ کو رہ رہ کے یاد آ کے
تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آشیانا

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہی قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں — میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
باغوں میں کھیلنے والے خوشیاں منا رہے ہیں — میں دل جلا اکیلا دکھ میں کراہتا ہوں

آتی نہیں صدائیں اُن کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

ارمان ہے یہ جی میں اڑ کر چمن کو جاؤں — ٹہنی پہ گل کے بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں
بیری کی شاخ پر ہو ویسا ہی پھر بسیرا — اُس اُجڑے گھونسلے کو پھر جاکے میں بساؤں
چگتا پھروں چمن میں دانے ذرا ذرا سے — ساتھی جو ہیں پرانے اُن سے ملوں ملاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی
اُڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے — دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے — دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد جس نے رہ کر دن اپنے ہوں گزارے — اس کو بھلا خبر کیا یہ قید کیا بلا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

سیّد کی لوحِ تُربت

اے کہ زائرن کے میری قبر پر آیا ہے تو — اے کہ مستانہ مے حُسنِ عقیدت کا ہے تو
اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر — اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ — شہر جو اُجڑا ہوا تھا اُس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی — صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی
یہ وہ نظارہ ہے یاں ہر گل سراپا دیدہ ہے — اپنی گلشن کی زمیں میں باغباں خوابیدہ ہے

ہے خموشی یاں رہینِ لذّتِ تقریر دیکھ
دیدۂ باطن سے تو اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں — ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیئے اپنی زباں — چھپکے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے ساماں پیدا ہوں تری تقریر سے — دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تحریر سے
دیکھ اپنوں میں کہیں پیدا نہ ہو بیگانگی — چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا بیکار کی
دین کے پردے میں تو دنیا کا سودائی نہ ہو — آڑ میں مذہب کے شوقِ عزت افزائی نہ ہو
گالیاں دینا کسی کو دین کی خدمت نہیں — یہ تعصب کوئی مفتاحِ درِ جنت نہیں

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

راہ بر کو قافلے کے ساتھ رہنا چاہئے
کیا چلے گا کارواں جب رہنما پیچھے رہے

ہو شراب حبِ قومی میں اگر سرشار تو
ہو نہ اپنی عزت افزائی کی تجھ کو آرزو

قافلہ جب تک پہنچ جائے نہ منزل کے قریب
رہنما ہوتے ہیں جو رستے میں دم لیتے نہیں

کیا مزہ رکھتی ہے ابنائے وطن کی فکر بھی
اس میں کچھ ہوتی نہیں اپنے کفن کی فکر بھی

دیکھ آوازِ ملامت سے نہ گھبرانا ذرا
عشق کے شعلے کو بھڑکاتی ہے یہ بن کر ہوا

وہ شجر ہے عشقِ اخواں زندگی ہے اس کا پھل
قوم کے عاشق کو چھو سکتا نہیں دستِ اجل

عالمِ عقبیٰ میں ہے سب سے بڑی عزت یہی
عشقِ اخواں میں اگر ملعون ہو جائے کوئی

عشق ہر صورت میں تسکینِ دلِ ناشاد ہے
پر کہیں نالہ کہیں شیون کہیں فریاد ہے

خود بخود منہ سے نکل جاتی ہے ایسی لَے ہے یہ
شیشۂ دل سے اچھل جاتی ہے ایسی مے ہے یہ

چوں زمینائے محبت خوردہ بودم بادۂ
تا نظر تا رفت ایں قومِ بخاک افتادۂ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

اپنے حق کے مانگنے میں رکھ ادب مدِ نظر
چاہئے سائل کو آدابِ طلب مدِ نظر

معنیٔ رمزِ اطاعت کی نہ ہو جس کو خبر　　چاہیٔے دنیا کو اس ناداں کی صحبت سے حذر

آب چوں در روغن افتد نالہ خیزد از چراغ

صحبتِ ناجنس باشد باعث آزارہا

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم　　دل ترا گیتی نما ہو گر مثال جامِ جم

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذ رحمانی ہے تو　　ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

دیکھ اے جادو بیاں تو نے اگر پروا نہ کی　　آبرو گر جائے گی اس گوہر یکدانہ کی

از شراب حب ہم جنساں خود مستانہ باش

شعلۂ شمع وطن را صورت پروانہ باش

میرا وطن

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سُنایا　　نانک نے جس چمن میں وحدت کا راگ گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا　　جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا　　سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا　　ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا نوح نبی کا ٹھہرا آ کر جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینا جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

گوتم کا جو وطن ہے جاپان کا حرم ہے عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے
مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے ہر پھول جس چمن کا فردوس ہے ارم ہے

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ترانہ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
اب تک رگوں میں تیری خوں ہے رواں ہمارا

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

دنیا کے بُت کدے میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

صبح

آتی ہے مشرق سے جب ہنگامہ در دامن سحر
منزلِ ہستی سے کر جاتی ہے خاموشی سفر

محفلِ قدرت کا آخر ٹوٹ جاتا ہے سکوت
دیتی ہے ہر چیز اپنی زندگانی کا ثبوت

چہچہاتے ہیں پرندے پا کے پیغامِ حیات
باندھتے ہیں پھول بھی گلشن میں احرامِ حیات

مسلمِ خوابیدہ اُٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو

وہ نکل آئی سحر گرم تماشا تو بھی ہو

ذرۂ عالم میں رہ پیدا ہو مثل آفتاب — دامن گردوں سے ناپیدا ہوں داغ سحاب

کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرم ستیز — پھر سکھا تاریکیٔ باطل کو آداب گریز

تو سراپا نور ہے زیبا ہے عریانی تجھے — اور عریاں ہو کے لازم ہے خود افشانی تجھے

ہاں نمایاں ہو کے برق دیدۂ خفاش ہو

اے دل کون و مکاں کے راز مضمر فاش ہو

پیام عمل

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط — اسی ہنگامہ سے محفل تہ و بالا کر دیں

پھونک ڈالا تھا کبھی دفتر باطل جس نے — حدّتِ دم سے اُسی شعلہ کو پیدا کر دیں

اہل محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق — سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو — تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا — سب کو محوِ رخِ سعدی و سلیمی کر دیں

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

درد ہے سارے زمانے کا ہمارے دل میں
جنس کم یاب ہے آ نرخ کو بالا کر دیں

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگر شیشۂ و پیمانۂ و مینا کر دیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقف تماشا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

تن آتش زدۂ شوق کو مانند سرشک
قطع منزل کے لئے آبلہ پا کر دیں

اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں

زاہد شہر کہ ہے سوختہ طبعی میں مثال
خشک ہے اس کو غریق نم صہبا کر دیں

ہر چہ در دل گزرد وقف زبان دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

شالامار باغ

یہ شالامار میں اک برگ زرد کہتا تھا
گیا وہ موسم گل جس کا رازدار ہوں میں

نہ پائمال کریں مجھ کو زائرانِ چمن
انہیں کی شاخ نشیمن کی یادگار ہوں میں

ذرا سے پتے نے بے تاب کر دیا دل کو
چمن میں آکے سراپا غم بہار ہوں میں

خزاں میں مجھ کو رُلاتی ہے یاد فصل بہار
خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں

اُجاڑ ہو گئے عہد کہن کے مے خانے　　گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار ہوں میں
سرودِ مرغِ نوا ریز و ہم نشینیٔ گل　　مرے نصیب کہاں غنچۂ مزار ہوں میں
پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

بلادِ اسلامیّہ

دلّی

سرزمیں دلّی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے　　ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اُجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں　　خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیر الاُمم کے تاجدار　　نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جل چکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

بغداد

ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہاں آباد بھی　　اس کرامت کا مگر حق دار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لئے سامانِ ناز　　لالۂ صحرائے یثرب یعنی تہذیبِ حجاز

خاک اس بستی کی ہو کیوں کر نہ ہمدوشِ ارم — جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبر کے قدم

جس کے غنچے تھے چمن ساماں وہ گلشن ہے یہی

کانپتا تھا جن سے رُوما اُن کا مدفن ہے یہی

قرطبہ

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور — ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور

بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی — اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی

دورِ گردوں میں ہوئے سیکڑوں تہذیب کے — پل کے نکلے مادرِ ایام کی آغوش سے

قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے

جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نم ناک ہے

قسطنطنیہ

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار — مہدیٔ اُمت کی سطوت کا نشانِ پائدار

صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے — آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے

نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا — تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا

کشورِ اسلام کا اے مسلمو دل ہے یہ شہر

سیکڑوں صدیوں کے کشت و خون کا حاصل ہے شہر

یثرب

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفےٰ — دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا

خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں — اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں

تجھ میں راحت اُس شہنشاہِ معظم کو ملی — جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

خشک لب انساں کو جس نے آبِ جاں پرور دیا — عقل کو آزادِ زنجیرِ توہم کر دیا

جس نے عہدِ وصل باندھا مدتِ دوراں کے ساتھ — جس نے پوری منصفی کی فطرتِ انساں کے ساتھ

جس کے ڈر سے وہم کا قصرِ کہن آئیں گرا — گردنِ انساں سے طوقِ راہبِ خود بیں گرا

نام لیوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے — جانشیں قیصر کے وارث مسندِ جم کے ہوئے

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام — ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

آہ یثرب دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو — نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

گو مٹانا بستیوں کا ہے شعارِ روزگار — عظمتِ ملت کی باقی یادگاریں ہیں ہزار

یہ ہویدا ہے کہیں مٹتے ہوئے آثار میں — یا نمایاں ہے کسی گرتی ہوئی دیوار میں

اُجڑے گورستاں کی خاموشی سے ہم آغوش ہے — شانِ پیشیں اشکِ خونِ قوم سے گُل پوش ہے

نالہ کرتی ہے کہیں خاموش ہوتی ہے کہیں اہلِ ملّت کی فراموشی کو روتی ہے کہیں

جلوہ گاہیں اس کی ہیں اپنی زیارت کیلئے

اشک باری کے لئے غم کی حکایت کیلئے

جزیرۂ سسلی

رُولے اب دل کھول کرلے دیدۂ خونابہ بار وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

یہ محل خیمہ تھا ان صحرا نشینوں کا کبھی بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے شعلۂ جاں سوز پنہاں جن کی تلواروں میں تھے

آفرینش جن کی دنیائے کہن کی تھی اجل جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل

زندگی دنیا کو جن کی شورشِ قُم سے ملی مخلصی انساں کو زنجیرِ توہّم سے ملی

جس کے آوازے سے لذت گیر اب تک گوش ہے

وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

آہ اے سسلی سمندر کی ہے تجھ سے آبرو رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو

زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے تیری شمعوں سے تسلّی بحر پیما کو رہے

ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اُس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا

حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظّارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر ۔ داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی ۔ ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا

یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں ۔ تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں

درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں ۔ جس کی تو منزل تھا میں اُس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے ۔ قصّہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سُوئے ہندوستاں لے جاؤں گا

خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلواؤں گا

حیدرآباد دکن

طلوعِ سحر

ہو رہی ہے زیرِ داماںِ اُفق سے آشکار ۔ صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر ۔ کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر ۔ محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار

شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آبدار

مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار

ہے تہِ دامانِ باد اختلاط انگیزِ صبح
شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہمکنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

گرچہ قدرت نے مجھے افسردہ دل پیدا کیا
آنکھ وہ بخشی کہ ہے نظارہ آشامِ بہار

کھینچ کر سوئے گلستاں لے گیا ذوقِ نظر
عاشقِ فطرت کو ہے صحنِ گلستاں کوئے یار

گل نے بلبل سے کہا اے ہم صفیر آیا ترا
کہتی تھی بلبل کہ اے مقصودِ چشمِ انتظار

اتنے دن غائب رہا تو گلشنِ پنجاب سے
کر لیا تھا کیا کسی صیاد نے تجھ کو شکار

کس سے کہتے راز اپنا لالہ ہائے شعلہ پوش
کس پہ کرتے دردِ دل اپنا عنادل آشکار

پوچھتی تھی روز مجھ سے نرگسِ شبنم فریب
ہو گیا غائب کہاں اپنے چمن کا رازدار

پھول فرقت میں تری سوزن بہ پیراہن رہے
دیدۂ قمری میں تھا صحنِ گلستاں خارزار

غنچۂ نوخیز کو یہہ کہہ کے بہلاتی تھی میں
ہے یہیں پوشیدہ وہ وارفتۂ فصلِ بہار

کچھ تو کہہ ہم سے بھی اس وارفتگی کا ماجرا
لے گیا تجھ کو کہاں تیرا دلِ بے اختیار

کس تجلی گاہ نے کھینچا ترا دامانِ دل
تیری مشتِ خاک نے کس دیس میں پایا قرار

کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کی
جس کے پھولوں میں ہوا اے ہم نوا میرا گزار

جس کے ذرّے مہرِ عالم تاب کو سامانِ نور
جس کی طور افروزیوں پر دیدۂ موسیٰ نثار

خطّۂ جنت فضا جس کی ہے دامن گیرِ دل
عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار

جس نے اسمِ اعظمِ محبوب کی تاثیر سے
وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار

نور کے ذروں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں
آئنہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار

آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گذر
بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار

اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت
آسمانِ اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار

کی وزیرِ شاہ نے وہ عزت افزائی مری
چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار

مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اُس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار

اُس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری
اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار

لیلیٔ معنی کا محمل اُس کی نثرِ دل پذیر
نظم اُس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار

اُس کے فیضِ پاک کی منت خواہ کانِ لعل خیز
بحرِ گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار

سلسلہ اُس کی مروت کا یونہیں لاانتہا
جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار

دل رُبا اُس کا تکلم خلق اُس کا عطرِ گل
غنچۂ گل کے لئے موجِ نفس بادِ بہار

ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مدبّر کو کہاں
جس کی ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار

ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر
خرقۂ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار

خاکساری جوہرِ آئینۂ عظمت بنی
دست وقفِ کار فرمائی و دل مصروفِ یار

نقش وہ اُس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار

شکر یہ احساں کا اے اقبال لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

گورستانِ شاہی

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
یعنی دھندلا سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے

چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں

کس قدر اشجار کی حسرت فزا ہے خامشی
بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

فطرتِ نظارۂ امکاں سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

آہ جولاں گاہِ عالم گیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار

زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے　　یہ خموشی اس کی ہنگاموں کی گورستان ہے

اپنے سکّانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے

کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

ابر کے روزن سے وہ بالائے بامِ آسماں　　ناظرِ عالم ہے نجمِ سبز فامِ آسماں

خاک بازی وسعتِ دنیا کا ہے منظر اُسے　　داستاں ناکامیِ انساں کی ہے ازبر اُسے

ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا　　آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا

گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لئے　　فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لئے

گرچہ باغِ زندگی سے گل بداماں ہے زمیں

سیکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا　　دیدۂ عبرت خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے　　آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر　　جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر

کہہ رہی ہے کوئی ایّامِ کہن کی داستاں　　چاندنی کرتی ہے میناروں سے کیا سرگوشیاں

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں

جو اُتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور   مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوے ناصبور

قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک   جن کے دروازہ پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل   جن کی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال

رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری   ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور

جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورشِ بزمِ طرب کیا عود کی تقریر کیا   قیدیٔ زندانِ غم کا نالۂ شب گیر کیا

عرصۂ پیکار میں ہنگامۂ شمشیر کیا   خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں

سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آ سکتی نہیں

روح مشتِ خاک میں زحمت کشِ بیداد ہے   کوچہ گردِ نے ہوا جس دم نفس فریاد ہے

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا   شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا - اڑ گیا

آہ کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم کیا گئے   زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے

موت ہر شاہ و گدا کی خواب کی تعبیر ہے

اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار اور اس دریائے بے پایاں کی ہیں موجیں مزار

اے ہوسِ خوں روکہ ہے یہ زندگی بے اعتبار یہ شرارے کا تبسم یہ خسِ آتش سوار

یہ قمر جو ناظمِ عالم کا اک اعجاز ہے پہنے سونے کی قبا محوِ خرامِ ناز ہے

چرخ بے انجم کی دہشت ناک وسعت میں مگر بے کسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقتِ سحر

اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہے جس کی فنا

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہیں بے اعتبار رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار

اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

ہے ہزاروں قافلے سے آشنا یہ رہ گزر چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور

مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں

آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے عظمتِ یونانِ و روما لوٹ لی ایام نے

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہیں رخصت ہوا
آسماں سے ابر آزاری اٹھا برسا گیا

صبح کے تارے پہ بھی مشرق کے رہزن کی نظر
وہ اڑا کر لے گیا آویزۂ گوشِ سحر

شب کے اختر دیدۂ خورشید سے ڈرتے ہیں یہ
بھیس شبنم کا بدل کر سیرِ گل کرتے ہیں یہ

ہے رگِ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی
کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی

سینۂ دریا شعاعوں کے لئے گہوارہ ہے
کس قدر پیارا لبِ جو مہر کا نظّارہ ہے

رات یہ تاروں بھری ذوقِ نظر کی عید ہے
ریزہ ریزہ ٹوٹ کر پیمانۂ خورشید ہے

اگتے ہیں شاخِ چمن سے شعلۂ بے سوزِ گل
روح کا فردوس ہے حسنِ نظر افروزِ گل

محوِ زینت ہے صنوبر جو یبار آئینہ ہے
غنچۂ گل کے لئے بادِ بہار آئینہ ہے

نعرہ زن رہتی ہے بلبل باغ کے کاشانہ میں
چشمِ انساں سے نہاں پتوں کے غزلت خانہ میں

اور بلبل مطربِ رنگیں نوائے گلستاں
جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں

عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے
خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں
وادی و کہسار میں نعرے شبان زادوں کے ہیں

زندگی کی مے سے مینائے جہاں لبریز ہے
منظرِ حسرت بھی ہے کوئی تو حسن آمیز ہے

پتّیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح　　دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح

اس نشاط آبادمیں گو عیش بے اندازہ ہے

ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں　　اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

اشک باری کے بہانے ہیں یہ اُجڑے بام و در　　گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشمِ تر

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم　　آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم

ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں　　برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

وادیِ گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ　　خواب سے اُمیدِ دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ

خندۂ طفلک سے ہے اس کی چمک محجوب تر　　چھو نہیں سکتی اسے صرصر کی موجِ پر خطر

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور

ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

زوالِ حمیت

رو ہیلا کس قدر ظالم جفا جو کینہ پرور تھا　　نکالیں شاہِ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے

دیا اہلِ حرم کو رقص کا فرماں ستم گرنے　　یہ اندازِ ستم کچھ کم نہ تھا آثارِ محشر سے

بھلا تعمیل اس فرمانِ غیرت کش کی ممکن تھی | شہنشاہی حرم کی نازنینانِ سمن بر سے
بنایا آہ سامانِ طرب بے درد نے اُن کو | نہاں تھا حسن جن کا چشم مہر و ماہ و اختر سے
دلِ نازک لرزتے تھے قدم مجبورِ جنبش تھے | رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدۂ تر سے
یونہیں کچھ دیر تک محوِ نظر آنکھیں رہیں اس کی | کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بارِ مغفر سے
کمر سے پھر وہ تیغِ جاں ستاں آتش فشاں کھولی | سبق آموزِ تابانی ہوا انجم جس کے جوہر سے
رکھا خنجر کو آگے اور کچھ پھر سوچ کر لیٹا | تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشمِ اختر سے
بجھائے خواب کے پانی نے اخگر اس کی آنکھوں سے | نگہ شرما گئی ظالم کی دردانگیز منظر سے
پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے | شکایت چاہئے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے
مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھا تکلف تھا | کہ غفلت دور ہے نامِ صف آرایانِ لشکر سے
مرا مقصد یہ تھا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی | مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

ہلالِ عیدِ رمضان

غرۂ شوال اے نورِ نگاہِ روزہ دار | آ کہ تھے تیرے لئے مُسلم سراپا انتظار

تیری پیشانی پہ تحریر پیام عید ہے　　یعنی تیری شام صبح عیش کی تمہید ہے
سرگزشت ملت بیضا کا تو آئینہ ہے　　اے مہ نو ہم کو تجھ سے الفت دیرینہ ہے
جس علم کے سایہ میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم　　دشمنوں کے خون میں رنگین قبا ہوتے تھے ہم
زندگی تیری جبیں بوسی اسی رایت کی ہے　　حسن روز افزوں سے تیرے آبرو ملت کی ہے
آشنا پرور ہے قوم اپنی وفا آئیں ترا　　ہے محبت خیز یہ پیراہن سیمیں ترا
وسعت ہستی میں گو رفعت تجھے منظور ہے　　اے فلک مسکن افق گردی ترا دستور ہے

اوج گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ　　رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر　　اے تہی ساغر ہماری آج ناداری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر　　اپنی آزادی بھی دیکھ ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ　　بت کدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا نظارہ بھی کر　　اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
بارش سنگ حوادث کا تماشائی بھی ہو　　امت مرحومہ کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
ہاں تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو　　اور جو بے آبرو تھے ان کی خودداری بھی دیکھ

جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلّم سے کیا
اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

رہ گئے اپنی کہن دامی سے ہم محرومِ صید
اس چمن میں اپنی قسمت کی نگوں ساری بھی دیکھ

مکر کے پھندے میں شہبازِ مراکش آ گیا
امتِ عیسیٰ کا آئینِ جہاں داری بھی دیکھ

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے میدانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ کر خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

ترنم اقبال

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری

میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری

تری راکھ میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

گلۂ وفائے جفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

دمِ زندگی رمِ زندگی غمِ زندگی سمِ زندگی
غمِ دم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

مرا عیش غم مرا شہد سم مری بود ہم نفس عدم ترا دل حرم گرو عجم ترا دیں خریدۂ کافری

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

مسافرانِ حرم کو ظالم رہِ کلیسا بتا رہے ہیں

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا کہ مصر و ہندوستاں کے مسلم بنائے ملت مٹا رہے ہیں

یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

فریبِ تہذیبِ نو میں آ کر جنہوں نے اپنا شعار چھوڑا جہان کی رہ گزر میں پامال صورتِ نقشِ پا رہے ہیں

غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں خدا تری قوم کو بچائے مسافرانِ حرم کو ظالم رہِ کلیسا بتا رہے ہیں

بتائیں کیا زندگی گزرتی ہے ہند کے بت کدے میں کیسی قتیلِ جور و جفا رہے ہیں شہیدِ ناز و ادا رہے ہیں

سنے گا اقبال کون ان کو وہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

مدینے کے کبوتر کی یاد

رحمت ہو تیری جان پر اے مرغِ نامہ بر آیا تھا اڑ کے ذروۂ بامِ حرم سے تو

پرواز جبرئیل تھی تیری اُڑان میں | کرتا نہ کیوں حدوث کو پیدا قدم سے تو
زمزم میں تر ہوئی تری منقار نغمہ ریز | کرتا رہا عرب کو نمایاں عجم سے تو
جاں کو بسا دیا تھا شمیم حجاز میں | لایا تھا تار توڑ کے زلفِ صنم سے تو
ہم کو دیا پیام الف لام میم کا | نا آشنا نہ تھا رہ و رسم الم سے تو
نفرت ہی آشیانۂ ہستی سے تھی تو کیوں | آیا اتر کے طارم کاخ عدم سے تو
تجھ پر ابو ہریرہ بھی قربان ہوں کہ تھا | وابستگانِ دامنِ فخر الامم سے تو

شاید انہیں کی راہ میں تو ہو گیا نثار
گر بچ سکا نہ گربہ کی مشقِ ستم سے تو

شفا خانۂ حجاز

اک پیشوائے قوم نے اقبال سے کہا | کھلنے کو جدّہ میں ہے شفا خانۂ حجاز
ہوتا ہے تیری خاک کا ہر ذرہ بے قرار | سنتا ہے تو کسی سے جو افسانۂ حجاز
دستِ جنوں کو اپنے بڑھا جیب کی طرف | مشہور تو جہاں میں ہے دیوانۂ حجاز

دار الشفا حوالیٔ بطحا میں چاہئے
نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہئے

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات | پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں

تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا | پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں

دیں اور کو حضور یہ پیغامِ زندگی | میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

آئے ہیں آپ لے کے شفا کا پیام کیا

رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا

حضورِ نبوی میں خونِ شہدا کی نذر

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا | جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا

قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن | نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا

ہوا رفیقِ اجل اشتیاقِ آزادی | سمندِ عمر کو اک اور تازیانہ ہوا

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو

حضور آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

کہا حضور نے اے عندلیبِ باغِ حجاز | کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز

ہمیشہ سرخوش جامِ ولا ہے دل تیرا | فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز

اڑا جو پستیٔ دنیا سے تو سوئے گردوں | سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز

نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

کہا یہ میں نے کہ یہ بھی خوشی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

فاطمہ

ایک عرب کی لڑکی جو غازیانِ طرابلس کو عین میدان کارزار میں مشک سے پانی پلاتی پھرتی تھی
اور بالآخر خود بھی جنت کو سدھاری

فاطمہ تو آبروئے ملتِ مظلوم ہے — ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
کس قدر عزت تجھے اے حورِ صحرائی ملی — غازیانِ ملتِ بیضا کی سقائی ملی
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر — دل کہ برگِ نازکِ گل سے بھی تھا پاکیزہ تر
موت کے اندیشۂ جانکاہ سے بیگانہ تھا — موجۂ خوں کی ہم آغوشی سے بھی ڈرتا نہ تھا

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی　　ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

سینۂ ملت میں ایسا جلوۂ نادیدہ تھا　　جس کے نظارے میں اک عالم سراپا دیدہ تھا

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے　　نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے　　ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں　　پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں　　آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

یعنی نوزائیدہ تاروں کا فضا میں ہے ظہور　　دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

جو ابھی اُبھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے　　جن کی ضو ناآشنا ہے قیدِ صبح و شام سے

ہے ابھی جن کے لئے رفتار کی لذت نئی　　آسماں کا خم نیا وسعت نئی عظمت نئی

جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی نو بھی ہے
اور خونِ بنتِ عبداللہ کا پرتو بھی ہے

بلال رضؓ

چمک اٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا — حبش سے تجھکو اٹھا کر حجاز میں لایا

ہوئی اسی سے ترے غم کدے کی آبادی — تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لئے — کسی کے شوق میں تونے مزے ستم کے لئے

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں — ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

ستم ہے شوق کی آتش کو مثلِ موجِ ہوا
خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا

نظر تھی مثلِ سلیماں ادا شناس تری — شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا — اویس طاقتِ دیدار کو ترستا تھا

مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا — ترے لئے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید
خنک دلے کہ تپید و دمے نیاسائید

ترے نصیب کا آخر چمک گیا اختر — علی کے سینے میں جو راز تھا کھلا تجھ پر

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر — کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دل تو زدند
چہ برق جلوہ بخاشاک حاصل تو زدند

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری — کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
نماز عشق حسین مجاز ہے گویا — یہی نماز خدا کی نماز ہے گویا
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی — نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اس کا

دُعا

یارب! دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرہ کو چمکا دے — پھر شوق تماشا دے پھر ذوق تقاضا دے
محروم تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے — دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل — اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
آتش نفسی جس کی کانٹوں کو جلا ڈالے — اس بادیہ پیما کو وہ آبلۂ پا دے
پیدا دل ویراں میں پھر شورش محشر کر — اس محمل خالی کو پھر شاہد لیلیٰ دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو — وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

رفعت میں مقاصد کو ہم دوشِ ثریا کر — خود داری ساحل دے آزادی دریا دے

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو — سینوں میں اُجالا کر دل صورتِ مینا دے

احساس عنایت کر آثار مصیبت کا — امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اُجڑے گلستاں کا

تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

۷۸۶

لامکاں کا مکاں

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں نے — خورشید میں قمر میں تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے خلوت کدے میں پایا — شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
جس کی چمک ہے پیدا جس کی مہک ہویدا — شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر — ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں

ہر شئے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے حسینہ تیری کمال اس کا

کنج تنہائی

تلاش گوشۂ عزلت میں پھر رہا ہوں میں — یہاں پہاڑ کے دامن میں آ چھپا ہوں میں
شگفتہ گیت کے چشموں کی دلبری ہے کمال — دعائے طفلکِ گفتار آزما کی مثال

ہے تختِ لعلِ فلک پر ظہورِ اخترِ شام
بہشتِ دیدۂ بینا ہے حسنِ منظرِ شام

سکوتِ شامِ جدائی ہوا بہانہ مجھے
کسی کی یاد نے سکھلا دیا ترانہ مجھے

یہ کیفیت ہے مری جانِ ناشکیبا کی
وہی مثال ہے طفلِ صغیرِ تنہا کی

اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز
صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز

یونہیں میں دل کو پیامِ شکیب دیتا ہوں
شبِ فراق کو گویا فریب دیتا ہوں

شاعر

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم

محفلِ نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

دنیا

چمنِ خار خار ہے دنیا
خونِ صد نو بہار ہے دنیا

ہے تمنا فزا ہوائے جہاں کیا شکستِ خمار ہے دنیا
جان لیتی ہے جستجو اس کی دولت زیر مار ہے دنیا
ہے نسیمِ جہاں خزاں پرور دیکھنے کو بہار ہے دنیا
زندگی نام رکھ دیا کس نے موت کا انتظار ہے دنیا
خون روتا ہے شوقِ منزل کا رہزنِ رہ گزار ہے دنیا
خندہ زن ہے فلک زوالِ جہاں چرخ کی رازدار ہے دنیا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند
اس چمن کو نہیں بہار پسند

مفلسی

ہاتھ اے مفلسی صفا ہے ترا ہائے کیا تیر بے خطا ہے ترا
تیرہ روزی کا ہے تجھی پہ مدار بدنصیبی کو آسرا ہے ترا
مایۂ صد شکست قیمتِ دل دہر میں ایک سامنا ہے ترا
مسکراتا ہے تجھ کو دیکھ کے زخم یہ کوئی صورت آشنا ہے ترا
موت مانگے سے بھی نہیں آتی درد کیا زندگی فزا ہے ترا

شورِ آوازِ چاکِ پیراہن　　لبِ اظہارِ مدعا ہے ترا
التجا پر خموشیِ منعم　　ایک فقرہ جلا بھنا ہے ترا
ہے جو دل میں نہاں کہیں کیونکر
ہائے تیرے ستم سہیں کیونکر

نوائے غم

زندگانی ہے مری مثلِ ربابِ خاموش　　جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہے لبریز آغوش
بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار　　جس کے ہر تار میں ہے سیکڑوں نغموں کے مزار
محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت　　اور شرمندۂ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت
آہ امیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ اس ساز نے مضراب کی کھائی نہ کبھی
اگر آئی ہے نسیمِ چمنِ طور کبھی　　سمتِ گردوں سے ہوائے نفسِ حور کبھی
چھیڑ آہستہ سے دیتی ہے مرا تارِ حیات　　جس سے ہوتی ہے رہا روحِ گرفتارِ حیات
نغمۂ یاس سے دھیمی سی صدا اٹھتی ہے　　اشک کے قافلے کو بانگِ درا اٹھتی ہے
جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

محبّت

عروسِ شب کی زلفیں تھیں ابھی نا آشنا خم سے
ستارے آسماں کے بے خبر تھے لذّتِ رم سے

قمر اپنے لباسِ نو میں بیگانہ سا لگتا تھا
ابھی واقف نہ تھا گردش کے آئینِ مسلم سے

ابھی امکاں کے ظلمت خانہ سے اُبھری ہی تھی دنیا
مذاقِ زندگی پوشیدہ تھا پہنائے عالم سے

کمالِ نظمِ ہستی کی ابھی تھی ابتدا گویا
ہویدا تھی نگینے کی تمنا چشمِ خاتم سے

سُنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیاگر تھا
صفا تھی جس کی خاکِ پا میں بڑھ کر ساغرِ جم سے

لکھا تھا عرش کے پایہ پہ اک اکسیر کا نسخہ
چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشمِ روحِ آدم سے

نگاہیں تاک میں رہتی تھیں لیکن کیمیاگر کی
وہ اس نسخہ کو بڑھ کر جانتا تھا اسمِ اعظم سے

بڑھا تسبیح خوانی کے بہانے عرش کی جانب
تمنائے دلی آخر بر آئی سعیِ پیہم سے

پھرایا فکرِ اجزا نے اُسے میدانِ امکاں میں
چھپے گی کیا کوئی شئے بارگاہِ حق کے محرم سے

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغِ جگر مانگا
اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے

تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفس ہائے مسیحِ ابنِ مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
ملک سے عاجزی افتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

ہوس نے یہ پانی ہستیٔ نوخیز پر چھڑکا گرہ کھولی ہنر نے اس کی گویا کارِ عالم سے
ہوئی جنبش عیاں ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا گلے ملنے لگے اُٹھ اُٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے
چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

حُسن اور زوال

اصلی خیال جرمن شعر میں دیکھا گیا۔ میں نے ناظرین کے لئے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اردو نظم میں منتقل کر دیا۔ اقبال

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سُنی فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سُنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

خفتگانِ خاک سے استفسار

مہرِ روشن چھپ گیا اُٹھی نقابِ روئے شام
شانۂ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام

کر رہا ہے آسماں جادو لبِ گفتار پر
شاہدِ شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر

یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
محفلِ قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے

کھیت سے آتا ہے دہقاں منہ میں کچھ گاتا ہوا
پائے گرد آلود دیتے ہیں مسافت کا پتا

رات کی آمد ہے مرغانِ ہوا خاموش ہیں
ابتدا و انتہا آپس میں ہم آغوش ہیں

شورشِ گفتارِ انساں کی صدا آتی نہیں
وہ صدائے نغمۂ گوش آشنا آتی نہیں

رنگ خاموشی میں ہے ڈوبی ہوئی موجِ ہوا
ہاں مگر اک دور سے آتی ہے آوازِ درا

دل کہ ہے بے تابیِ الفت میں دنیا سے نفور
کھینچ لاتا ہے مجھے ہنگامۂ عالم سے دور

منظرِ حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشینِ خفتگانِ کنجِ تنہائی ہوں میں

اے عدم کے رہنے والو تم جو یوں خاموش ہو
مے وہ کیسی ہے نشے میں جس کے تم بیہوش ہو

اے مئے غفلت کے مستو تو کہاں رہتے ہو تم
کچھ کہو اُس دیس کی باتیں جہاں رہتے ہو تم

واں بھی جل مرتا ہے نورِ شمع پر پروانہ کیا
اُس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا

یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل
شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل

رشتۂ و پیوندیاں کے جان کے آزار ہیں
اُس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں

واں بھی آزارِ غریبی سے کبھی روتے ہیں کیا
اُس ولایت میں بھی دل ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں کیا

یہ خوشامد اُس ولایت کا بھی کیا دستور ہے
واں بھی کیا سنگِ ریا سے شیشۂ دل چور ہے

واں کی عزت بھی حکومت بھی حبابِ آسا ہے کیا
واں بھی یہ دولت ہی ہمانۂ شرافت کا ہے کیا

آہ اس کشور میں تو جوہر کی عزت کچھ نہیں
واں کی نگری میں بھی اس موتی کی قیمت کچھ نہیں؟

خرمنِ دہقاں کو ہے بجلی کا ڈر ایسا ہی کیا
اُس جہاں میں ہے تبسّم پرخطر ایسا ہی کیا

فکر اینٹوں کی وہاں بھی ہے مکاں کے واسطے؟
تنکے چنتے ہیں وہاں بھی آشیاں کے واسطے؟

واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا
امتیازِ ملّت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا

واں بھی کیا فریادِ بلبل پر چمن روتا نہیں؟
اِس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں؟

باغ ہے جنت و یا اک منزلِ آرام ہے
یا رخِ بے پردۂ حُسنِ ازل کا نام ہے

کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے
آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصدِ تادیب ہے

کیا عوض رفتار کے اُس دیس میں پرواز ہے
موت کہتا ہے جسے انساں وہ کیا راز ہے

اس نگر کی طرح کیا واں بھی ہے رونا موت کا
کیا وہاں کی زندگی کو بھی ہے کھٹکا موت کا

اضطرابِ دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے
علمِ انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے

یاں تو چلمن کی جھلک سے اور بڑھ جاتا ہے شوق
کیا وہاں پر جلوۂ بے پردہ دکھلاتا ہے شوق

دید سے تسکین پاتا ہے دلِ مہجور بھی
لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی

کیا دلِ انساں کو واں بھی ذوقِ استفہام ہے
کیا وہاں بھی جستجو میں روح کو آرام ہے

ہم جسے کہتے ہیں ہستی وہ ہے کیا تصویرِ حسن
ہے صداقت بھی سعادت بھی وہاں تفسیرِ حسن

آہ وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے
یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے

تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

غم

شاعر نے یہ فلسفیانہ رنگ کی نظم اپنے قدیم اور ہم جماعت دوست میاں فضل حسین صاحب ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔ بیرسٹر ایٹ لا کو (جو ۱۹۲۱ء میں صوبہ پنجاب کی جدید کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تھے اور آج کل اسی کونسل میں وزیرِ تعلیم ہیں) اُن کی والدہ کی رحلت کے المناک موقع پر غم غلط کرنے کے لئے لکھ کر بھیجی تھی۔ اس میں جس خوبی سے بقا و فنا اور فلسفۂ غم کے نازک مسئلہ کو حل کیا گیا ہے ۔ اربابِ ذوقِ سلیم ہی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی　　اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی　　ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں

جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں　　نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے　　روح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال　　غازہ ہے آئینۂ دل کیلئے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے　　ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے　　راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں غم روح کا اک نغمۂ خاموش ہے

جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

شام جس کی آشنائے نالۂ یارب نہیں　　جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں

جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے ناآشنا　　جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے　　عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے

گو بظاہر تلخئ دوراں سے آرامیدہ ہے　　زندگی کا راز اُس کی آنکھ سے پوشیدہ ہے

ایک نظمِ دہر کا ادراک ہے حاصل تجھے
کیوں نہ ہو آساں غم و اندوہ کی منزل تجھے

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق — عقلِ انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے — ظلمتِ ہستی میں یہ سورج سدا تابندہ ہے
رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر — جوشِ الفت بھی دل عاشق سے کر جاتا سفر
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں — روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی
زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی

آتی ہے ندی جبینِ کوہ سے گاتی ہوئی — آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے اس کا صورتِ رخسارِ حور — گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہو جاتا ہے چور
نہر جو تھی اُس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے — یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیمابِ رواں پھٹ کر پریشاں ہو گئی — مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہو گئی
ہجر ان قطروں کو لیکن وصل کی تعلیم ہے — دو قدم پر پھر وہی جو مثلِ تارِ سیم ہے
ایک اصلیت میں ہے نہرِ روانِ زندگی — گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی

پستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم

عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

عقل جس دم دہر کی آفات میں محصور ہو
یا جوانی کی اندھیری رات میں مستور ہو

دامنِ دل بن گیا ہو رزم گاہ خیر و شر
راہ کی ظلمت سے ہو مشکل سوئے منزل سفر

خضرِ ہمت ہو گیا ہو آرزو سے گوشہ گیر
فکر جب عاجز ہو اور خاموش آوازِ ضمیر

وادیٔ ہستی میں کوئی ہم سفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

عشق اور موت

سہانی نمودِ جہاں کی گھڑی تھی
تبسم فشاں زندگی کی کلی تھی

کہیں مہر کو تاجِ زر مل رہا تھا
عطا چاند کو چاندنی ہو رہی تھی

سیہ پیرہن شام کو دے رہے تھے
ستاروں کو تعلیمِ تابندگی تھی

کہیں شاخِ ہستی کو لگتے تھے پتے
کہیں زندگی کی کلی پھوٹتی تھی

کہیں عجز سے گردنیں جھک رہی تھیں
رعونت کہیں مانعِ بندگی تھی

فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا — ہنسی گل کو پہلے پہل آرہی تھی

عطا درد ہوتا تھا شاعر کے دل کو — خودی تشنہ کام مئے بے خودی تھی

پتنگا کہیں مست ذوقِ تپیدن — کہیں شمع کو نازشِ دلبری تھی

جو قمری کو ملتا تھا طوقِ غلامی — صنوبر کو انعامِ آزادگی تھی

اُٹھی اول اول گھٹا کالی کالی — کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی

یہ گرمِ فغاں تھی وہ محوِ تبسم — جو بلبل کا غم تھا وہ گل کی خوشی تھی

زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں

مکاں کہہ رہا تھا کہ میں لامکاں ہوں

غرض اس قدر تھا نظارہ بہ پیارا — کہ نظّارگی ہو نظارہ سراپا

فرشتہ تھا اک عشق تھا نام جس کا — کہ تھی رہبری اُس کی سب کا سہارا

فرشتہ کہ پتلا تھا بے تابیوں کا — ملک کا ملک اور پارے کا پارا

وہ دردِ محبت وہ ایمانِ ہستی — وہ افشانِ حسنِ ازل کا ستارا

نئے سیر فردوس کو جا رہا تھا — قضا سے ملا راہ میں وہ قضا را

یہ پوچھا ترا نام کیا کام کیا ہے — نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا

ہوا سُن کے گویا قضا کا فرشتہ — اجل ہوں مرا کام ہے آشکارا

اڑاتی ہوں میں رختِ ہستی کے پرزے — بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا

مری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے — پیامِ فنا ہے اُسی کا اشارا

مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی — وہ آتش ہے میں سامنے اُس کے پارا

شرر بن کے رہتی ہے انساں کے دل میں — وہ ہے نورِ مطلق کی آنکھوں کا تارا

ٹپکتی ہے آنکھوں سے بن بن کے آنسو — وہ آنسو کہ ہو جن کی تلخی گوارا

سرِ کوہ چمکے جو وہ بن کے بجلی — تو ہو غیرتِ طور ہر سنگ خارا

سُنی عشق نے گفتگو جب قضا کی — ہنسی اُس کے لب پر ہوئی آشکارا

گری اس تبسّم کی بجلی اجل پر — اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ
قضا تھی شکارِ قضا ہو گئی وہ

خاموشی

یہہ اشعار چاندنی رات میں دریائے نیکر (ہائڈلبرگ جرمنی) کے کنارے موزوں ہوئے تھے۔

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا — فطرت ہے مراقبے میں گویا

وادی کے صدا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
ٹینکر کا خرام بھی سکوں ہے

اے دل خاموش تو بھی ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

والدۂ مرحومہ کی یاد میں

اس نظم میں شاعر عالی خیال کی طبع گوہر ریز نے فلسفۂ موت اور حیات بعد الممات کی جو تصویر کھینچی ہے اس کی نظیر کسی اور زبان کی شاعری میں ملنی مشکل ہے۔

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بے چارگی تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں
انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبور نمو گلزار میں

نغمۂ بلبل ہو یا آواز خاموش ضمیر
ہے اسی زنجیر عالمگیر میں ہر شئے اسیر

اپنی نادانی میں انساں کس قدر آسودہ ہے

تہمتِ تاثیر سے موجِ نفس آلودہ ہے

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِ مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیلِ رواں

قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے لطفِ زیر و بم رہتا نہیں

علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے

گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنابی نہیں

جانتا ہوں آہ میں آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز

میرے لب پر قصۂ نیرنگیٔ دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں خنداں نہیں گریاں نہیں

پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے
آہ یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

گریۂ سرشار سے بنیادِ جاں پایندہ ہے
درد کے عرفاں سے عقلِ سنگدل شرمندہ ہے

موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا
گنجِ آب آورد سے معمور ہے دامن مرا

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا

رفتہ و حاضر کو گویا پا بہ پا اس نے کیا
عہدِ طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا

جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جانِ ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیٔ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

علم کی سنجیدہ گفتاری بڑھاپے کا شعور   دنیوی اعزاز کی شوکت جوانی کا غرور

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم   سایۂ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم

بے تکلف خندہ زن ہیں فکر سے آزاد ہیں

پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

کس کو ہوگا اب وطن میں آہ میرا انتظار   کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا   اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

زندگی کی رہ میں میں جب طفلِ نو رفتار تھا   جادۂ خوابیدہ ہر ہر گام پر دشوار تھا

قطع تیری ہمت افزائی سے یہ منزل ہوئی   میری کشتی بوسۂ گستاخ لبِ ساحل ہوئی

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا   گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات   تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی   میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند   تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند

کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا   وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو مرا

وہ قوی فطرت کہ ہے جس کی طبیعت استوار   جس کے دل سے کانپتے ہیں حادثاتِ روزگار

تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ   صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

آہ یہ دنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

زلزلے ہیں بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت

موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں

نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

قافلے میں غیرِ فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں

ختم ہو جائیگا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پسِ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی

سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا

جھاڑیاں جن کے قفس میں قید ہے آہِ خزاں
سبز کر دے گی انہیں بادِ بہارِ جاوداں

خفتہ خاک پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا
عارضی محمل ہے یہ مشتِ غبار اپنا تو کیا

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو۔ یہ وہ گوہر نہیں

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

ہم سمجھتے ہیں ثباتِ زندگی پیکر سے ہے پیکروں کی بے ثباتی جورِ پیکر گر سے ہے

خام فکری سے شفق خونِ سحر سمجھی گئی صبحِ شبنم سے بیاضِ چشمِ تر سمجھی گئی

آہ غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے

جنتِ نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب موجِ مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو

آہ سیمابِ پریشاں، انجمِ گردوں فروز شوخ یہ چنگاریاں ممنونِ شب ہے جن کا سوز

دیکھنے میں گرچہ ہے مثلِ شرر ان کا فروغ خندہ زن ہے صرصرِ ایامِ پراں کا فروغ

عقل جس سے سر بزانو ہے وہ مدت ان کی ہے سرگزشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہے

پھر یہ انساں آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر

جو مثالِ شمع روشن محفلِ قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعتِ فطرت میں ہے

جس کی نادانی صداقت کے لئے بیتاب ہے
جس کا ناخن سازِ ہستی کے لئے مضراب ہے

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا
کم بہا ہے آفتاب اپنے ستاروں سے بھی کیا

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشوونما کے واسطے بیتاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی خود فزائی کے لئے مجبور ہے

سردیِ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

ہے لحد اس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

کہتے ہیں اہلِ جہاں دردِ اجل ہے لادوا
زخمِ فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا

دل مگر غم کرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقۂ زنجیرِ صبح و شام سے آزاد ہے

وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں
وقت زخمِ تیغِ فرقت کا کوئی مرہم نہیں

سر پہ آجاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں
اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں

ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے
خونِ دل بہتا ہے آنکھوں کے سرشک آباد سے

آدمی تابِ شکیبائی سے گو محروم ہے
اس کی فطرت میں یہ اک احساسِ نامعلوم ہے

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

رختِ ہستی خاکِ غم کی شعلہ افشانی سے ہے
سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے

آہ یہ ضبطِ فغاں غفلت کی خاموشی نہیں
آگہی ہے یہ دلاسائی فراموشی نہیں

کیسی حیرت خیز ہے ظلمت فروشی رات کی
دن کے ہنگاموں کا ہے مدفن خموشی رات کی

ظلمتِ آشفتہ کاکل وسعتِ عالم میں ہے
اشکِ انجم در گریباں روز کے ماتم میں ہے

طفلکِ شش روزۂ کون و مکاں خاموش ہے
رات کے آغوش میں لپٹا ہوا بے ہوش ہے

آبِ دریا خفتہ ہے موجِ ہوا غش کردہ ہے
پست ہر ہستی کے سازِ زندگی کا پردہ ہے

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغِ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح

لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمستِ نوا کرتی ہے یہ

سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سیکڑوں نغموں سے بادِ صبح دم آباد ہے

خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رودبار
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہمکنار

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

دامِ سیمینِ تخیّل ہے مرا آفاق گیر
کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگاہ ہے

ہے جہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے

نورِ فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں
تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

بیراگ

رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

بس کہ میں افسردہ دل ہوں درخورِ محفل نہیں
تو مرے قابل نہیں ہے میں ترے قابل نہیں

قید ہے دربانِ سلطان و شبستانِ وزیر
توڑ کر نکلے گا زنجیرِ طلائی کا اسیر

زخمِ پیکاں ہے نگاہِ چشمِ نو دولت مجھے
ہے ترے عجزِ خوشامد زادہ سے نفرت مجھے

گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے
اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

مدتوں تیرے خود آراؤں سے ہم صحبت رہا
مدتوں بے تاب موجِ بحر کی صورت رہا

مدتوں بیٹھا ترے ہنگامۂ عشرت میں میں
روشنی کی جستجو کرتا رہا ظلمت میں میں

مدتوں ڈھونڈا کیا نظارۂ گل خار میں
آہ وہ یوسف نہ ہاتھ آیا ترے بازار میں

مدتوں ضبطِ تکلم کے ستم سہتا رہا
اشک کی صورت میں اپنا حالِ دل کہتا رہا

اب مگر بارِ خموشی میں اٹھا سکتا نہیں
آئینہ مشرب ہوں راز اپنا چھپا سکتا نہیں

چشمِ حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے

چھوڑ کر مانندِ بو تیرا چمن جاتا ہوں میں
رخصت اے بزمِ جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں

گھر بنایا ہے سکوت دامن کہسار میں　　آہ یہ لذت کہاں موسیقی گفتار میں

ہم نشین نرگس شہلا رفیق گل ہوں میں　　ہے چمن میرا وطن ہمسایۂ بلبل ہوں میں

شام کو آواز چشموں کی سلاتی ہے مجھے　　صبح فرش سبزہ سے کوئل جگاتی ہے مجھے

مل کے رہتی ہیں تہِ دامانِ دریا مچھلیاں　　یعنی وہ چاندی کے طائر بے پر و بے آشیاں

مل کے اڑتے مل کے گاتے ہیں گلستاں میں طیور　　خیمہ زن انسان ہیں شہروں میں ویرانوں سے دور

باغ عالم میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دل شاعر کو لیکن کنج تنہائی پسند

ہے جنوں مجھ کو کہ گھبراتا ہوں آبادی میں میں　　ڈھونڈھتا پھرتا ہوں کس کو کوہ کی وادی میں میں

شوق کس کا سبزہ زاروں میں پھراتا ہے مجھے　　اور چشموں کے کنارے پر سلاتا ہے مجھے

کوہ کے دامن میں کیا لیے مدعا پھرتا ہوں میں　　کیا مصاف زندگی سے بھاگتا پھرتا ہوں میں

طعنہ زن ہے تو کہ شیدا کنج عزلت کا ہوں میں　　دیکھ اے غافل پیامی بزم قدرت کا ہوں میں

ہم وطن شمشاد کا قمری کا میں ہم راز ہوں　　اس چمن کی خامشی میں گوش بر آواز ہوں

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لئے　　دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لئے

عاشق عزلت ہے دل نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں　　خندہ زن ہوں مسند دارا و اسکندر پہ میں

لیٹنا زیر شجر رکھتا ہے جادو کا اثر　　شام کے تارے پہ جب پڑتی ہو رہ رہ کر نظر

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا کانٹا دل سے نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

پتوں کا ہو نظارہ میری کتاب خوانی
دفتر ہو معرفت کا جو گل کھلا ہوا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارا
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ   پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی   جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو   سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

پچھم کو جا رہا ہو کچھ اس ادا سے سورج   جیسے کوئی کسی کے دامن کو کھینچتا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم   امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے اُن کو کٹیا مری دکھا دے   جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن   میں اُس کا ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں   روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو

ظلمت جھلک رہی ہو اس طرح چاندنی میں   جو آنکھ میں سحر کی سرمہ لگا ہوا ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے   رونا مرا وضو ہو نالہ مرا دعا ہو

دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پہ آنسو   سرسبز جن کی نم سے بوٹا اُمید کا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے   تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے

بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

شمشاد گل کا بیری گل یاسمن کا دشمن   ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے

اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر ― میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے
وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت ― ساقی نہیں وہ باقی وہ انجمن نہیں ہے

در محفلے کہ یاراں شرب مدام کردند
نوبت بما چو آمد آتش بجام کردند

پیامِ صبح

اجالا جب ہوا رخصت جبینِ شب کی افشاں کا ― نسیمِ زندگی پیغام لائی صبحِ خنداں کا
جگایا بلبلِ رنگیں نوا کو آشیانے میں ― کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اس نے دہقاں کا
طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنّور سے توڑا ― اندھیرے میں اڑایا تاجِ زر شمعِ شبستاں کا
پڑھا خوابیدگانِ دیر پر افسونِ بیداری ― برہمن کو دیا پیغام خورشیدِ درخشاں کا
ہوئی بامِ حرم پر آکے یوں گویا مؤذن سے ― نہیں کھٹکا ترے دل میں نمودِ مہرِ تاباں کا
ہلائی اُس نے زنجیرِ درِ مے خانہ یہ کہہ کر ― اٹھو دروازہ کھولو نسخۂ خوابِ پریشاں کا
اٹھایا آکے سبزے کو صدائے قم باذنی نے ― دبایا پائے نازک اس نے ہر طفلِ دبستاں کا
صدا دی اس طرح دیوارِ گلشن پر کھڑے ہو کر ― چٹک او غنچۂ گل تو مؤذن ہے گلستاں کا
اٹھایا قطرۂ شبنم کو اُس نے بسترِ گل سے ― چھڑایا نیند کے ہاتھوں سے دامن رنگِ گلستاں کا

دیا جب حکم صحرا کو چلو اے قافلے والو	چمکنے کو ہے جگنو بن کے ہر ذرہ بیاباں کا
گئی گور غریباں کو جو وہ زندوں کی بستی سے	تو یوں بولی نظارہ دیکھ کر شہر خموشاں کا

ابھی آرام سے لیٹے رہو میں پھر بھی آؤں گی
سلا دوں گی جہاں کو خواب میں تم کو جگاؤں گی

عہد طفلی

ہاں اٹھا اے ساحر ایام یہ جادو ذرا	ابلق گردوں نہ ہو محو دم آہو ذرا
ہائے پھر آجا کہیں سے عمر رفتہ تو ذرا	لا وہ نظارہ پئے چشم تماشا جو ذرا

خون رلواتے ہیں ایام جوانی کے مزے
لا کہیں سے پھر وہی ایام طفلی کے مزے

ہائے وہ عالم کہ عالمگیر تھی اپنی ادا	غیرت صد فصل گل تھی اپنے گلشن کی ہوا
مکتب طفلی میں غیر از درس آزادی نہ تھا	زنگ افکار جہاں سے شیشۂ دل تھا صفا

مایہ دار صد مسرت اک تبسم تھا مرا
گوش دل لگ جائیں جس پر وہ تکلم تھا مرا

تھے دیار نو زمین و آسماں میرے لئے	وسعت آغوش مادر یک جہاں میرے لئے

تھی ہر اک جنبش نشانِ لطف جاں میرے لئے   خالی از مفہوم خود میری زباں میرے لئے

درد اس عالم میں جب کوئی رُلاتا تھا مجھے

شورشِ زنجیرِ در میں لطف آتا تھا مجھے

تکتے رہنا ہائے وہ پہروں تلک سوئے قمر   وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اس کا سفر

پوچھنا رہ رہ کے اُس کے کوہ و صحرا کی خبر   اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر

آنکھ وقفِ دید تھی لب مائلِ گفتار تھا

دل مرا جامِ شرابِ ذوقِ استفسار تھا

آہ اے دنیا نمک پاش خراشِ دل ہے تو   جس کے ہر دانے میں سو بجلی ہے وہ حاصل ہے تو

جو مسافر سے پرے رہتی ہے وہ منزل ہے تو   جس کی لیلیٰ مایۂ وحشت ہو وہ محمل ہے تو

میرے ہاتوں کوئی جویائے مئے تسکیں نہ ہو

ایمن از مارِ زمینِ گلستاں گلچیں نہ ہو

ایک پرندہ اور جگنو

یہ نظم انگلستان کے ایک نازک خیال شاعر ولیم کوپر کی ایک مشہور و مقبول نظم "اے نائٹ ان گیل اینڈ گلو ورم" سے ماخوذ ہے بچوں کی اکثر درسی کتابوں میں درج

کی جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہاں نقل کا پایہ اصل سے بھی بلند و بالا ہو گیا ہے ۔

سرِ شام ایک مرغِ نغمہ پیرا — کسی ٹہنی پہ بیٹھا گا رہا تھا
چمکتی چیز اک دیکھی زمیں پر — اڑا طائر اُسے جگنو سمجھ کر
کہا جگنو نے او مرغِ نوا ریز — نہ کر بے کس پہ منقارِ ہوس تیز
تجھے جس نے چہک گُل کو مہک دی — اُسی اللہ نے مجھ کو چمک دی
لباسِ نور میں مشہور ہوں میں — پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں
چہک تیری بہشتِ گوش اگر ہے — چمک میری بھی فردوسِ نظر ہے
پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی — تجھے اُس نے صدائے دل رُبا دی
تری منقار کو گانا سکھایا — مجھے گلزار کی مشعل بنایا
چمک بخشی مجھے آواز تجھ کو — دیا ہے سوز مجھ کو ساز تجھ کو
مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز — جہاں میں ساز کا ہے ہمنشیں سوز
قیامِ بزمِ ہستی ہے انہیں سے — ظہورِ اوج و پستی ہے انہیں سے

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بُوستاں کی

مکافاتِ عمل

ہر عمل کے لئے ہے ردِّ عمل
دہر میں عیش کا جواب ہے نیش
شیر سے آسمان لیتا ہے
انتقام غزال و اشتر و میش
سرگزشتِ جہاں کا سرِ خفی
کہہ گیا ہے کوئی نکو اندیش
شمع پروانہ را بسوخت و لے
زود بریاں شود بروغنِ خویش

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو
مآل حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو
متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو
ہے کیا ہراس فنا صورتِ شرر تجھ کو
زمیں سے دور دیا آسمان نے گھر تجھ کو
مثالِ ماہ اُڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے
چمکنے والے مسافر عجب یہ بستی ہے
جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر   فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل   عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

دو ستارے

آئے جو قِراں میں دو ستارے   کہنے لگا ایک دوسرے سے
یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب   انجامِ خرام ہو تو کیا خوب
تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو
ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو
لیکن یہ وصال کی تمنّا   پیغامِ فراق تھی سراپا
گردش تاروں کا ہے مقدّر   ہر ایک کی راہ ہے مقرّر
ہے خواب ثباتِ آشنائی
آئینِ جہاں کا ہے جدائی

شبنم اور ستارے

اک رات یہ کہنے لگے شبنم سے ستارے
ہر صبح میسر ہیں نئے تجھ کو نظارے

کیا جانیے تو کتنے جہاں دیکھ چکی ہے
جو بن کے مٹے ان کے نشاں دیکھ چکی ہے

زہرہ نے سنی ہے یہ خبر ایک ملک سے
انسانوں کی ہستی ہے بہت دور فلک سے

کہہ ہم سے بھی اس کشور دل کش کا فسانہ
گاتا ہے قمر جس کی محبت کا ترانہ

اے تارو نہ پوچھو چمنستان جہاں کی
گلشن نہیں اک بستی ہے وہ آہ و فغاں کی

آتی ہے صبا واں تو پلٹ جانے کی خاطر
بیچاری کلی کھلتی ہے مرجھانے کی خاطر

کیا تم سے کہوں کیا چمن افروز کلی ہے
ننھا سا کوئی شعلۂ بے سوز کلی ہے

گل نالۂ بلبل کی صدا سن نہیں سکتا
دامن سے مرے موتیوں کو چن نہیں سکتا

دل سوختۂ گرمی فریاد ہے شمشاد
زندانی ہے اور نام کو آزاد ہے شمشاد

ہیں مرغ نوا ریز گرفتار غضب ہے
اُگتے ہیں تہِ سایۂ گل خار غضب ہے

رہتی ہے سدا نرگس بیمار کی تر آنکھ
دل طالب نظارہ ہے محروم نظر آنکھ

تارے شررِ آہ ہیں انساں کی زباں میں
میں گریۂ گردوں ہوں گلستاں کی زباں میں

نادانی ہے یہ گرد زمیں طوف قمر کا — سمجھا ہے کہ درماں ہے وہاں داغ جگر کا

بنیاد ہے کاشانۂ عالم کی ہوا پر
فریاد کی تصویر ہے قرطاس فنا پر

انسان اور بزم قدرت

صبح سورج کو جو چڑھتے ہوئے دیکھا میں نے — بزم معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے

پرتو مہر کے دم سے ہے اُجالا تیرا — سیم سیّال ہے پانی ترے دریاؤں کا

مہر نے نور کا گہنا تجھے پہنایا ہے — تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے

گل و گلزار ترے خلد کی تصویریں ہیں — یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں

سرخ پوشاک ہے پھولوں کی درختوں کی ہری — تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری

ہے ترے خیمۂ گردوں کی طلائی جھالر — بدلیاں لعل سی آتی ہیں اُفق پر جو نظر

کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی — مے گل رنگ خم شام میں تو نے ڈالی

نور یکساں ترے ویرانے میں آبادی میں — شہر میں دشت میں کہسار کی ہر وادی میں

رتبہ تیرا ہے بڑا شان بڑی ہے تیری — پردۂ نور میں مستور ہے ہر شئے تیری

صبح اک گیت سراپا ہے تری عظمت کا — زیر خورشید نشاں تک بھی نہیں ظلمت کا

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیونکر

نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز سیہ بخت سیہ کار ہوں میں

میں یہ کہتا تھا کہ آواز کہیں سے آئی
بامِ گردوں سے و یا صحنِ زمیں سے آئی

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود

انجمن حسن کی ہے تو تری تصویر ہوں میں
عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار جو مجھ سے نہ اُٹھا وہ اُٹھایا تو نے

نور کے واسطے محتاج ہے ہستی میری
اور بے منتِ خورشید چمک ہے تیری

ہو نہ خورشید تو ویراں ہو گلستاں میرا
منزلِ عشق کی جا نام ہو زنداں میرا

آہ اے رازِ عیاں کے نہ سمجھنے والے
حلقۂ دامِ تمنا میں اُلجھنے والے

جو سمجھنے کی تھی وہ بات نہ سمجھی تو نے
یعنے مے پی ہے تمیزِ من و تو کی تو نے

ہائے غفلت کہ تری آنکھ ہے پابندِ مجاز
نازِ زیبا تھا تجھے تو ہے مگر گرمِ نیاز

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

شمع و پروانہ

پروانہ تجھ کو کرتا ہے اے شمع پیار کیوں
کرتا ہے اپنی جان کو تجھ پر نثار کیوں

وہ بات تجھ میں کیا ہے کہ یہ بے قرار ہے
جاں در ہوائے لذت خواب مزار ہے

کیوں بے قرار کرتی ہے تیری ادا اسے
آداب عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے

کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا
پھونکا ہوا ہے کیا تری برق نگاہ کا

آزار موت میں اسے آرام جاں ہے کیا
شعلے میں تیرے زندگی جاوداں ہے کیا

غم خانۂ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو
اس تفتہ دل کا نخل تمنا ہرا نہ ہو

بے اختیار سوز سے تیرے بھڑک اٹھا
قسمت کا اپنی بن کے ستارہ چمک اٹھا

گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذت سوز و گداز ہے

کچھ اس میں جوش عاشق حسن قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے

تھوڑی سی روشنی پہ فدا ہو رہا ہے یہ
اک نور ہے کہ جس میں فنا ہو رہا ہے یہ

پروانہ کیا ہے اک دل ایذا طلب ہے یہ
عین وصال و سوز جدائی غضب ہے یہ

پروانہ اور ذوق تماشائے روشنی
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

بچہ اور شمع

کیسی حیرانی ہے یہ اے طفلکِ پروانہ خو　　شمع کے شعلے کو گھڑیوں دیکھتا رہتا ہے تو

یہ مری آغوش میں بیٹھے ہوئے جنبش ہے کیا　　روشنی سے کیا بغل گیری ہے تیرا مدعا

اس نظارے سے ترا ننھا سا دل حیران ہے

یہ کسی دیکھی ہوئی شئے کی مگر پہچان ہے

شمع اک شعلہ ہے لیکن تو سراپا نور ہے　　آہ اس محفل میں یہ عریاں ہے تو مستور ہے

دستِ قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا　　تجھ کو خاکِ تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا

نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقابِ آگہی　　ہے غبارِ دیدۂ بینا حجابِ آگہی

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ

خواب ہے غفلت ہے سرمستی ہے بے ہوشی ہے یہ

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن　　دیکھتی ہے آنکھ ہر قطرے میں یاں طوفانِ حسن

حسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے　　مہر کی ضوگستری شب کی سیہ پوشی میں ہے

آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ　　شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ

عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں　　طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں

ساکنانِ صحنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے
ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے

چشمۂ کہسار میں دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں صحرا میں ویرانے میں آبادی میں حسن

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

شمع

تیری طرح سے میں بھی ہوں اے شمع دردمند
فریاد در گرہ صفتِ دانۂ سپند

دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں تجھے
اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے

ہو شمعِ بزمِ عیش کہ شمعِ مزار تو
ہر حال اشکِ غم سے رہی ہم کنار تو

ان اشک باریوں میں طہارت کا راز ہے
کیسا وضو ہے یہ کہ سراپا نماز ہے

یک بیں تری نظر صفتِ عاشقانِ راز
میری نگاہ مایۂ آشوبِ امتیاز

کعبے میں بت کدے میں ہے یکساں تری ضیا
میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا

ایذا پسند ہے دلِ اندوہ گیں ترا
کیا تجھ پہ راز غم کدۂ دہر کھل گیا

ہے شان آہ کی ترے دودِ سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں

ازمہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

جلتی ہے تو کہ برقِ تجلّی سے دور ہے — بے درد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے
سمجھے کہ خامشی ہے مآلِ ضیائے شمع — اے وائے گفتگوئے لبِ بے صدائے شمع
خورشیدِ شب ہے جلوۂ ظلمت رُبا ترا — تجھ کو بھی ہے خبر کہ یہ ہے چاندنا ترا
تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں — دانائے بے قراریٔ محشر اثر نہیں
میں جوشِ اضطراب سے سیماب وار بھی — آگاہِ اضطرابِ دلِ بے قرار بھی

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنی گداز کا

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار — خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتش کدے ہزار
جلتی اسی شرار سے ہے شمعِ ماسوا — سامانِ طرزِ ظلمتِ شب ہے یہ چاندنا
یہ امتیازِ رفعت و پستی اسی سے ہے — خوشبو ہے گل میں بادہ میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی — اصل نظارہ من و تو ہے یہ آگہی

آزاد دست بردِ بقا و فنا ہوں میں
کشتہ ہو یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق
آوازِ کن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کن کی بہار دیکھ
ایک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی
شامِ فراق صبح تھی میری نمود کی

وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا

قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

جوں نے کمندِ نالۂ دل میں اسیر ہوں
فرقت میں نیستاں کی سراپا نفیر ہوں

یادِ وطن فسردگیِ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی کبھی ذوقِ طلب بنی

اے شمع حالِ قیدیِ دامِ خیال دیکھ
مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ

مضمونِ فراق کا ہوں ثریا نشاں ہوں میں
آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں ہوں میں

باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود

گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے مضمون بلند ہے

چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے
عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے
طوقِ گلوئے حسن تماشا پسند ہے

منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں
اے شمع میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں

محمود اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے — کیا غفلت آفریں یہ مےِ خانہ ساز ہے
در دا کہ وہم غیر میں ہوں میں پھنسا ہوا — آزرِ خلیل ہے بتِ پندار کا ہوا
صیاد آپ حلقۂ دامِ ستم بھی آپ — بامِ حرم بھی۔ طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں — کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں
ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں — پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

دل خار زارِ کم نگہی میں اُلجھ نہ جائے
ڈرتا ہوں کوئی میری فغاں کو سمجھ نہ جائے

جُگنو

اکثر متداولہ درسی کتب میں یہ نظم مرقوم ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ بلا لحاظِ سن وسال بچے، جوان، بوڑھے سب اس کو پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں یہ ہے سہل لیکن ممتنع۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

حسن قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا جویا یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانہ کو تپش دی جگنو کو روشنی دی

رنگیں نوا بنایا مرغان بے زباں کو
گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی

نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی

رنگیں کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے سبز جوڑا شبنم کی آرسی دی

سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بے کلی دی

اک مشت گل میں رکھا احساس کا شرارہ
انساں کو آگہی کیا ظلمت کو چاندنی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے

یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیِ ازل ہو

شعاعِ آفتاب

صبح جب میری نگہ سودائیِ نظارہ تھی
آسماں پر اک شعاعِ آفتاب آوارہ تھی

میں نے پوچھا اس کرن سے اے سراپا اضطراب
تیری جانِ ناشکیبا میں ہے کیسا اضطراب

تو کوئی چھوٹی سی بجلی ہے کہ جس کو آسماں
کہہ رہا ہے خرمنِ اقوام کی خاطر جواں

یہ تڑپ ہے یا ازل سے تیری خو ہے کیا ہے یہ
رقص ہے آوارگی ہے جستجو ہے کیا ہے یہ

خفتہ ہنگامے ہیں میری ہستیِ خاموش میں
پرورش پائی ہے میں نے صبح کے آغوش میں

مضطرب ہر دم مری تقدیر رکھتی ہے مجھے
جستجو میں لذتِ تنویر رکھتی ہے مجھے

برق آتش خو نہیں فطرت میں گو ناری ہوں میں
مہرِ عالم تاب کا پیغامِ بیداری ہوں میں

سرمہ بن کر چشمِ انساں میں سما جاؤں گی میں
رات نے جو کچھ چھپا رکھا تھا دکھلاؤں گی میں

کند تلواریں ہوئیں عہدِ زرہ پوشی گیا
جاگ اٹھ تو بھی کہ دورِ خود فراموشی گیا

گل

تجھے کیوں فکر ہے اے گل دلِ صد چاکِ بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

اگر منظور ہو تجھ کو خزاں نا آشنا رہنا
جہانِ رنگ و بو سے پہلے قطعِ آرزو کر لے

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

تنک بخشی کو استغنا ہے پیغامِ خجالت ہے
نہ رہ منت کشِ شبنم نگوں جام و سبو کر لے

نہیں یہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہہ کر اڑ گئی شبنم
مذاقِ جورِ گلچیں ہو تو پیدا رنگ و بو کر لے

گل رنگیں

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں　　واقفِ افسردگی ہائے تپیدِ دل نہیں
زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں　　کیوں یہ تسکینِ خموشی ذرا مجھے حاصل نہیں

سوز باتوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے

تیرے حسنِ گلشن آرا پر جھکا جاتا ہے دل　　لذتِ نظارہ سے بے خود ہوا جاتا ہے دل
پر لگا کر صورتِ بلبل اُڑا جاتا ہے دل　　حلقہ ہائے موجِ نکہت میں پھنسا جاتا ہے دل

کام مجھ کو دیدۂ قدرت کے الجھاؤں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں　　یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں
آہ یہ دستِ جفا جو اے گلِ رنگیں نہیں　　کس طرح تجھ کو سمجھاؤں کہ میں گلچیں نہیں

آشنائے سوز و فریادِ دلِ مہجور ہوں
پھول ہوں میں بھی مگر اپنے چمن سے دور ہوں

آہ اے گل تجھ میں بھی جوہر وہی مستور ہے　　جو دلِ انساں میں مضمر مثلِ موجِ نور ہے

میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے
ہائے پھر مجھ سے جدائی کیوں تجھے منظور ہے

دل میں کچھ آتا ہے لیکن منہ سے کہہ سکتا نہیں
اور تکلیفِ خموشی کو بھی سہہ سکتا نہیں

بھا گئے انداز تیرے اے گلِ رعنا مجھے
مار ڈالے گا خوشی سے جھومنا تیرا مجھے

کیوں نہیں ملتی یہ تسکین قرار افزا مجھے
ہاں سکھا دے کچھ سبق اپنی خموشی کا مجھے

باغِ ہستی میں پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

یہ پریشانی مگر جمعیتِ عرفاں نہ ہو
یہ حنا بندِ کفِ محبوبۂ ایماں نہ ہو

یہ خزاں اپنی بہارِ گلشنِ رضواں نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ انساں نہ ہو

ہے یہ تاریکی مگر اک شمعِ دل افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

گلِ پژمردہ

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں
کس طرح تجھ کو تمنائے دلِ بلبل کہوں

ہم سفر آخر تری بو کی تری رنگت ہوئی
ہائے کیا تاراج تیرے حسن کی دولت ہوئی

بلبلِ نالاں نہ پہچانے اگر دیکھے تجھے — ہو پشیماں عشق پر اپنے جو پہچانے تجھے

تھی کبھی موجِ صبا گہوارۂ جنباں ترا — نام تھا صحنِ گلستاں میں گلِ خنداں ترا

تیرے احساں کا نسیمِ صبح کو اقرار تھا — باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا

سرگراں سی اب شعاعِ مہرِ تاباں تجھ سے ہے — آہ وہ بادِ سحر بھی اب گریزاں تجھ سے ہے

دیدۂ گل چیں کو اب تیری ادا بھاتی نہیں — لال جوڑا اب شفق بھی تجھ کو پہناتی نہیں

شاخ تیری بارِ بلبل سے نہ اب خم کھائے گی — آب گوہر سے نہ اب شبنم تجھے نہلائے گی

آہ وہ تتلی وہ اک معصومیت اڑتی ہوئی — تھک کے اب پرواز سے تجھ پر نہ بیٹھے گی کبھی

وہ ذرا سا جانور دل دادۂ آوارگی — کھینچتی تھی سوئے گلشن جس کو شیرینی تری

گرچہ تھا صحنِ چمن میں عاشقِ شیدا ترا — اب تجھے دیکھے تو بھاگے الحذر کہتا ہوا

میری آنکھوں کو مگر اے گل بھلا لگتا ہے تو — آتی ہے مجھ کو تری پژمردگی سے اپنی بو

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا — ہے نہاں تیری اداسی میں دلِ ویراں مرا

ہے مرے سینے میں بھی پوشیدہ زخمِ بے رفو — داغ بن کر رہ اسی اجڑے ہوئے گلشن میں تو

لب مرا ہے بلبلِ رنگیں نوا تیرے لئے — میری ٹھنڈی آہ ہے بادِ صبا تیرے لئے

میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو — خواب میری زندگی ہے جس کی ہے تعبیر تو

ہمچو خود از نیستانِ خود حکایت می کنم

بشنو اے گل از جدائی ہا شکایت می کنم

درد عشق

اے دردِ عشق ہے گہر آبدار تو — نامحرموں میں دیکھ نہ ہو آشکار تو

پنہاں تہِ نقاب تری جلوہ گاہ ہے — ظاہر پرست محفل نو کی نگاہ ہے

ہاں خود نمائیوں کی تجھے جستجو نہ ہو — منت پذیر نالۂ بلبل کا تو نہ ہو

خالی تری شراب سے گلشن کا جام ہو — پانی کی بوند گریۂ شبنم کا نام ہو

پروانہ سوئے شمع نہ قسمت کو رو کے آئے — ذوق تپش سے بزم میں آزاد ہو کے آئے

پوشیدہ کنج دل میں کہیں راز ہو ترا — اشک جگر گداز نہ غماز ہو ترا

گویا زبانِ شاعر رنگیں بیاں نہ ہو — آواز نے میں شکوۂ فرقت نہاں نہ ہو

یہ دورِ نکتہ چیں ہے کہیں چھپ کے بیٹھ رہ
جس دل میں تو مکیں ہے وہیں چھپ کے بیٹھ رہ

غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ دیکھ — جویا نہیں تری نگہ نارسیدہ دیکھ

اس بزم میں کسی کو نہیں آرزو تری — موتی ہے تو مٹے نہ کہیں آبرو تری

رہنے دے جستجو میں خیال بلند کو — حیرت میں چھوڑ دیدہ حکمت پسند کو

جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں — قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں

یہ انجمن ہے کشتۂ نظارۂ مجاز | مقصد تری نگاہ کا خلوت سرائے راز

ہر دم مے خیال کی مستی سے چور ہے | کچھ اور آج کل کے کلیموں کا طور ہے

محفل یہ مر مٹی ہے شراب مجاز پر | اور اک طعنہ زن ہے سرور گداز پر

رہبر تو خضر فکر ہے اور ذوق دید ہے | ہاتھوں میں انجمن کے پرانی کلید ہے

نایاب ہو کے اپنی حقیقت دکھا نہیں | جو عجز میں نہاں ہے وہ رفعت دکھا نہیں

فکر بلند غرق شراب غرور ہے | اس بے خبر کو راہ پہ لانا ضرور ہے

طے کر کے آسماں کو جو بے مدعا پھرے | دیوانہ وار تیرا پتہ پوچھتا پھرے

بے تاب پھر جہاں ہو ترے اشتیاق میں
گریاں ہو چشم حسن بھی تیرے فراق میں

شب و شاعر

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں | خاموش صورت گل مانند بو پریشاں

تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو | مچھلی ہے کوئی میرے دریائے نور کی تو

یا تو مری جبیں کا تارا گرا ہوا ہے | رفعت کو چھوڑ کر جو بستی میں جا بسا ہے

خاموش ہو گئے ہیں تار رباب ہستی | ہے میرے آئینے میں تصویر خواب ہستی

دریا کی تہ میں چشمِ گرداب سو رہی ہے
ساحل سے لگ کے موجِ بے تاب سو رہی ہے

بستی زمیں کی کیسی ہنگامہ آفریں ہے
یوں سو گئی ہے جیسے آباد ہی نہیں ہے

شاعر کا دل ہے لیکن ناآشنا سکوں سے
آزاد رہ گیا تو کیوں کر مرے فسوں سے

میں ترے چاند کی کھیتی میں گہر بوتا ہوں
چھپ کے انسانوں سے مانندِ سحر روتا ہوں

دن کی شورش میں نکلتے ہوئے شرماتے ہیں
عزلتِ شب میں مرے اشک ٹپک جاتے ہیں

تجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو
تپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو

برق ایمن مرے سینے میں پڑی روتی ہے
دیکھنے والی ہے جو آنکھ کہاں سوتی ہے

صفتِ شمعِ لحد مردہ ہے محفل میری
آہ اے رات بڑی دور ہے منزل تیری

عہدِ حاضر کی ہوا راس نہیں ہے اس کو
ابھی نقصان کا احساس نہیں ہے اس کو

ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں
تیرے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں

صدائے درد

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذت گفتار نے / پھونک ڈالا جب چمن کو آتش پیکار نے

پھر بلا لے مجھ کو اے صحرائے وسط ایشیا / آہ اس بستی میں اب میرا گزارہ ہو چکا

پار لے چل مجھ کو پھر اے کشتیٔ موج اٹک / اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک

ہاں سلام اے مولد بوذاسف گوتم تجھے / اب فضا تیری نظر آتی ہے نامحرم مجھے

الوداع اے سیرگاہ شیخ شیراز الوداع / اے دیار بالمیک نکتہ پرواز الوداع

الوداع اے مدفن ہجویریٔ اعجاز دم / رخصت اے آرام گاہ شنکر جادو رقم

الوداع اے سرزمین نانک شیریں بیاں / رخصت اے آرام گاہ چشتیٔ عیسیٰ نشاں

سرزمیں تیری قیامت کی نفاق انگیز ہے / وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق انگیز ہے

رمز الفت سے مرے اہل وطن غافل ہوئے / کارزار عرصۂ ہستی کے ناقابل ہوئے

بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب / ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

اپنی اصلیت سے ناواقف ہیں کیا انساں یہاں / غیر اپنوں کو سمجھتے ہیں عجب ناداں یہاں

لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں / اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

جس کا اک مدت سے دھڑکا تھا وہ دن آنے کو ہے / صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے

دل حزیں ہے جان رہین رنج بے اندازہ ہے / آہ اک دفتر تھا اپنا وہ بھی بے شیرازہ ہے

امتیاز قوم و ملت پر مٹے جاتے ہیں یہ / اور اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھاتے ہیں یہ

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی — کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی
روح کا جوبن نکھرتا ہے اسی تدبیر سے — آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے
رنگ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں — خونِ آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں
اصل محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی — اک بیاضِ نظمِ ہستی کی ہیں تصویریں سبھی

ایک ہی شئے ہے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے

تصویرِ درد

یہ پُر درد قومی نظم انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے انیسویں سالانہ جلسہ میں ایک مجمعِ کثیر کے سامنے پڑھی گئی۔ حاضرینِ جلسہ نے نہایت شوق اور ذوق کے ساتھ اس کو سنا اور بے حد داد دی۔

بندِ اوّل

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری — خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
ہوئی ہے سرمۂ آواز گو لذت خموشی کی — نگہ بن بن کے آنکھوں سے نکلتی ہے فغاں میری
یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں — یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

مری حیرت روانی سوز ہے اس درجہ اے ساقی — کہ مینا بن گئی آخر شراب ارغواں میری
شکارِ خوفِ رسوائی ہے میری نو گرفتاری — کسی صورت ہو یا رب بیاری نیاز داں میری
اٹھا رے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے — چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
اڑائی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے — چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری
ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے — سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری
الٰہی پھر مزہ کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا — حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری
مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا — وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
زفیضِ دل تپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم

بند دوم

ریاضِ دہر میں نا آشنائے بزمِ عشرت ہوں — خوشی روتی ہے جس کو میں وہ محرومِ مسرت ہوں
مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی — میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں
شکایت آسماں کی میرے لب پر آ نہیں سکتی — کہ میں قسمت کا مارا آپ ہی اپنی مصیبت ہوں
مری ہستی نے آلودہ کیا دامانِ عصیاں کو — وہ عاصی ہوں کہ میں اپنے گناہوں کی ندامت ہوں
پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا — سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا — سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں

خزینہ ہوں چھپایا مجھ کو مشت خاک صحرا نے — کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں

مرے طوف جبیں کو اڑ کے خاک آستاں آئی — میں وہ درماندۂ دامانِ صحرائے عبادت ہوں

سیہ کاری مری زاہد سے کہتی ہے یہ محشر میں — سبھی کچھ ہوں مگر ہم رنگ محراب عبادت ہوں

نظر میری نہیں ممنون سیر عرصۂ ہستی — میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں

مری ہستی نہیں وحدت میں کثرت کا تماشا ہے — کہ خود عاشق ہوں خود معشوق ہوں خود درد فرقت ہوں

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ — میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

وضو کے واسطے آتا ہے کعبہ لے کے زمزم کو — الٰہی کونسی وادی میں ہوں محو عبادت ہوں

نہ چھیڑ او کاٹنے والے مجھے میرے نیستاں سے — سراپا صورت نے تیری فرقت کی شکایت ہوں

نجف میرا مدینہ ہے مدینہ ہے مرا کعبہ — میں بندہ اور کا ہوں امت شاہ ولایت ہوں

جو سمجھوں اور کچھ خاک عرب میں سونے والے کو — مجھے معذور رکھ میں مست صہبائے محبت ہوں

یہی صہبا ہے جو رفعت بنا دیتی ہے پستی کو
اسی صہبا میں آنکھیں دیکھتی ہیں راز ہستی کو

بند سوم

شراب عشق میں کیا جانے کیا تاثیر ہوتی ہے — کہ مشت خاک جس سے رشک اکسیر ہوتی ہے

یہ وہ مے ہے تکلم بن کے رہتی ہے زبانوں میں
نگاہوں میں مثالِ سحرِ تسخیر ہوتی ہے

زباں میری ہے لیکن کہنے والا اور ہے کوئی
مری تقریر گویا اور کی تقریر ہوتی ہے

بس اے ذوقِ خموشی رخصتِ فریاد دے مجھ کو
کہ چپ بیٹھوں تو گویائی گریباں گیر ہوتی ہے

اثر ایسا کیا ہے دل پہ تاراجِ گلستاں نے
مجھے پروازِ رنگِ گل صدائے تیر ہوتی ہے

سنا ہے میں نے جو کچھ اہلِ محفل کو سناتا ہوں
خموشی بے محل مثلِ دمِ شمشیر ہوتی ہے

نفس کا آئینہ باندھا ہے میں نے اپنی آہوں میں
مری ہر بات میرے درد کی تصویر ہوتی ہے

خود اپنے آنسوؤں میں رونے والا چھپ کے بیٹھا ہو
صدائے نالۂ دل کی یہی تاثیر ہوتی ہے

تمیزِ ما و من ہوتی نہیں حرفِ محبت میں
مثالِ خامشی گویا مری تقریر ہوتی ہے

سنے ہیں اہلِ محفل نے فسانے حال و ماضی کے
مرے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہوتی ہے

بُرا ہوں یا بھلا ہوں میرا کہنا سب کو بھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

بندِ چہارم

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں

اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

ہوائے اعتبارِ ملت و آئین کی موجوں نے
غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے جھگڑے ہو رہے ہیں باغبانوں میں

جہاں خوں ہو رہا ہے کارزارِ زندگانی سے
مئے غفلت کے ساغر پی رہے ہیں نوجوانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

سن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے۔ ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک۔ لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

تغیر اس طرح کا محفلِ ہستی میں آیا ہے
کہ ہے چپ بیٹھ رہنا بھی تباہی کے نشانوں میں

مزا دنیا نہیں کچھ صورتِ گل صد زباں ہونا
زباں جب ایک بھی گویا نہ ہو اتنی زبانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

ہوا ایکبار کی آخر اجاڑے گی گلستاں کو
خدا رکھے یہ ہے اپنے پرائے مہربانوں میں

قیامت ہے کہ ہر ذرے سے پیدا سو مصیبت ہے
زمیں بھی اپنی شاید جا ملی ہے آسمانوں میں

اڑا لے جائے گی موج ہوائے نیستی ان کو
نہ ہو جب راہ پیمائی کی طاقت ناتوانوں میں

رلایا خوں مری آنکھوں کو تیری خوابِ غفلت نے
مری تقدیر میں لکھا تھا رونا کلکِ قدرت نے

بندِ پنجم

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا — لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
دکھا دوں گا میں لے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو — کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا
جلاتا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے — تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کر کے چھوڑوں گا
نہیں بے وجہ وحشت میں اڑانا خاکِ زنداں کا — کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کر کے چھوڑوں گا
شریکِ محنتِ زنداں ہوں گو یوسف صفت خود بھی — مگر تعبیرِ خوابِ اہلِ زنداں کر کے چھوڑوں گا
مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ دردآشنا پیدا — چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا
ابھی مجھ دل جلے کو ہم صفیرو اور رونے دو — کہ میں سارے چمن کو شبنمستاں کر کے چھوڑوں گا
تعصب نے مری خاکِ وطن میں گھر بنایا ہے — وہ طوفاں ہوں کہ میں اس گھر کو ویراں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو — جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا
مجھے اے ہمنشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں — کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا
اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی — مسلمانوں کو آخر نامسلماں کر کے چھوڑوں گا
اٹھا دوں گا نقابِ عارضِ محبوبِ یک رنگی — تجھے اس خانہ جنگی سے پشیماں کر کے چھوڑوں گا

دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

جو تیرا درد تھا تاکا ہے اُس نے میرے پہلو کو

تری افتاد نے توڑا ہے میرے دست و بازو کو

بند ششم

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے گزاری عمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے

اڑا کر لے گئی لذت تجھے آوارہ رہنے کی چمن میں کچھ نہ دیکھا صورتِ بادِ صبا تو نے

تری تعمیر میں مضمر ہوئی افتادگی کیوں کر لگائی ہے مگر اس گھر کو خشتِ نقشِ پا تو نے

تلاشِ نکہتِ اخگر سے پیدا ہے جنوں تیرا جو پہنی صورتِ تصویر کاغذ کی قبا تو نے

سبق لیتا رہا افتادگی کا خاکِ ساحل سے نہ سیکھا موجِ دریا سے علاجِ خوابِ پا تو نے

رہا دل بستۂ محفل، مگر اپنی نگاہوں کو کیا بیرونِ محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر مگر دیکھی نہ اس آئینہ میں اپنی ادا تو نے

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے بُرا تو نے

سراپا نالۂ بے داد سوزِ زندگی ہو جا سپند آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے

صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے کفِ آئینہ پر باندھی ہے او ناداں حنا تو نے

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے

نہیں ہے وہ ہستی کیا بندۂ حرص و ہوا ہونا
قیامت ہے مگر اوروں کو سمجھا دہریا تو نے

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بت پندار کو اپنا خدا تو نے

کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل جو مطلق تھا مقید کر دیا تو نے

وہ حسنِ عالم آرا تیرے دل میں جلوہ گستر تھا
غضب ہے آسمانوں میں دیا اس کا پتا تو نے

نہیں ممکن شناسائی ہو تجھ کو رمزِ وحدت سے
صدائے غیر سمجھا جب سنی اپنی صدا تو نے

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

بند ہفتم

نظر اس دور میں مجھ کو ترا جینا نہیں آتا
کہ صہبائے محبت کا تجھے پینا نہیں آتا

پکڑ کر عجز کا دامن پہنچ عرشِ معلیٰ پر
نگاہوں کو نظر اُس بام کا زینا نہیں آتا

عدو صبحِ صفائے دل کی ہے ظلمت تعصب کی
مقابل چشمِ نابینا کے آئینہ نہیں آتا

نہیں ہے نور سے محشر میں تو کیا خاک دیکھے گا
کہ تجھ کو دیکھنا اے دیدۂ بینا نہیں آتا

یہ بہتر تھا کہ تو اے شیشۂ دل چور ہو جاتا
صفا رہنا تجھے مانندِ آئینہ نہیں آتا

اکارت ہے بناوٹ سے ترا رونا نمازوں میں
کہ ہاتھ اس طرح وہ پوشیدہ گنجینہ نہیں آتا

بنا آنکھوں کو جامِ اشک۔ دل کو درد کی مینا
مزا جینے کا کچھ بے ساغر و مینا نہیں آتا

بجھا دینا ہی اچھا ہے چراغ زندگانی کا — محبت میں جو مر مر کے تجھے جینا نہیں آتا

بنا اس راہ میں ذوق طلب کو ہم سفر اپنا — اکیلے لطف سیر وادی سینا نہیں آتا

تلاش خضر کب تک تشنۂ زہر محبت ہو — جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

غمی گوییم قیامت جوش زن یا شور طوفاں شو

ز طوفاں دست بردار آنچہ نتوانی شدن آں شو

بند ہشتم

دکھا وہ حسن عالم سوز اپنی چشم پرنم کو — جو تڑپاتا ہے پروانے کو رلواتا ہے شبنم کو

تبسم سے غرض ہے پردہ داری چشم گریاں کی — چھپا کر بیٹھ صبح عید میں شام محرم کو

ترا نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اس کا — بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشم آدم کو

اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا — نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا — یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

جمال یوسف یثرب کو دیکھ آئینۂ دل میں — نہ ڈھونڈ اے دیدۂ حیراں نمود ابن مریم کو

نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگ گل تک بھی — یہ رفعت کی تمنا ہے کہ لے اڑتی ہے شبنم کو

پھرا کرتے نہیں مجروح الفت فکر درماں میں — یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

شفا دیکھی ہے بیماری میں کیا ان دردمندوں نے — کہ بے حاصل سمجھتے ہیں تلاش ابن مریم کو

خدا جانے یہ بندے کونسی آتش میں جلتے ہیں ۔ کہ خاکستر کی اک مٹھی سمجھتے ہیں جہنم کو

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے

ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے

بند نہم

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا ۔ علاج زخم ہے آزاد احسان رفو رہنا

شراب بے خودی سے تا فلک پرواز ہے میری ۔ شکست رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بو رہنا

تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں ۔ عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم با وضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا ۔ چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں ۔ غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو ۔ تجھے بھی چاہیئے مثل حباب آب جو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری ۔ اگر منظور ہے دنیا میں او بے گانہ خو رہنا

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی ۔ سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے

کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

بند دہم

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی وطن بھی ہے — یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی — جرس بھی کارواں بھی راہبر بھی راہزن بھی ہے

مرض کہتے ہیں سب اس کو یہ لیکن ہے مرض ایسا — چھپا جس میں علاجِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا — یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں — یہ شیریں بھی ہے گویا بیستوں بھی کوہکن بھی ہے

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو — مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے ورنہ — زباں بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

شجرِ ملت

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے

ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے — کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے

فصلِ خزاں ہے تیرے گلستاں میں خیمہ زن — خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے

جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور — رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے

شاخ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو　　ناواقف نہیں ہے قاعدۂ روزگار سے

مذہب کے ساتھ واسطۂ استوار رکھ

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

فلسفۂ اسیری

یہ دل پذیر اشعار آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس (امرتسر) میں مولانا شوکت علی اور محمد علی کی تشریف آوری کے موقع پر پڑھے گئے۔ اب تو ہر وطن پرست کا یہی دستور العمل ہے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند　　قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے　　مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر　　کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست

کیں سعادت قسمت "شہباز و شاہیں" کردہ اند

خطاب بہ مسلم

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاج سر دارا

تمدن آفریں خلاق آئین جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں الفقر فخری کا رہا شان امارت میں
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے در پہ بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی ق
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی۔ کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

نالۂ یتیم

یہ نظم انجمن حمایت الاسلام (لاہور) کے پندرھویں سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی
اس نظم پر حاضرین نے اشک فشانی کے ساتھ ساتھ زر فشانی بھی خوب کی
واہ واہ کے ساتھ آہ آہ کی بھی دردناک صدائیں ہر طرف سے آرہی تھیں

آہ! کیا کہیئے کہ اب پہلو میں ایسا دل نہیں بجھ گئی جب شمع روشن درخور محفل نہیں
اے مصافِ نظم ہستی ہیں ترے قابل نہیں ناامیدی جس کو طے کرلے یہ وہ منزل نہیں

ہائے کس منہ سے شریک بزم میخانہ ہوں میں
ٹکڑے ٹکڑے جس کے ہوجائیں وہ پیمانہ ہوں میں

خارِ حسرت غیرت نوک سناں ہونے لگا یوسفِ غم زینتِ بازار جاں ہونے لگا
دل مرا شرمندۂ ضبط فغاں ہونے لگا نالۂ دل روشناس آسماں ہونے لگا

کیوں نہ وہ نغمہ صدائے رشک صد فریاد ہو
جو سرود عندلیب گلشن برباد ہو

پنجۂ وحشت بڑھا چاک گریباں کے لئے اشک غم ڈھلنے لگے پابوس داماں کے لئے

مضطرب ہے یوں دل نالاں ساباں کے لئے جس طرح بلبل تڑپتا ہے گلستاں کے لئے

لیں گے ہم ہنگامۂ ہستی میں اب کیا بیٹھ کر
روئیے جا کر کسی صحرا میں تنہا بیٹھ کر

قابل عشرت دل خوکردۂ حسرت نہیں درخور بزم طرب شمع سر تربت نہیں
زیر گردوں شاہد آرام کی صورت نہیں غیر حسرت غازۂ رخسارۂ راحت نہیں

صبح عشرت بھی ہماری غیرت صد شام ہے
ہستئ انساں غبار خاطر آرام ہے

ہے قیام بحر ہستی جزر و مد اُمید کا گاہے گاہے آ نکلتی ہے مسرت کی ہوا
زندگی کی نور الفت سے ملی جس دم ضیا لے کے طوفان ستم ابر تغیر آ گیا

ہے کسی کو کام دل حاصل کوئی ناکام ہے
اس نظارہ کا مگر خاک لحد انجام ہے

اے فلک تجھ سے تمنائے سعادت پروری ہر ستارہ ہے ترا داغ دل تنک اختری
تو نے رکھا ہے کسے حرماں نصیبی سے بری اے مسلماناں فغاں از دور چرخ چنبری

دوستی از کس نمی بینیم یاراں را چہ شد
دوستی کو آخر آمد دوست داراں را چہ شد

نطق کر سکتا نہیں کیفیتِ غم کو عیاں   اس کی تیزی کو مٹا دیتے ہیں اندازِ بیاں
آ نہیں سکتی زباں تک رنج و غم کی داستاں   خندہ زن میرے لبِ گویا پہ ہے دردِ نہاں

عجزِ گویائی ہے گویا حکمِ قیدِ خامشی
مجرمِ اظہارِ غم کو یہ سزا ملنے لگی

زخمِ دل کے واسطے ملتا نہیں مرہم مجھے   اپنی قسمت کا ہے رونا صورتِ آدم مجھے
ظلّ دامانِ پدر کا ہے زبس ماتم مجھے   ہاں! ڈبو دے! اے محیطِ دیدۂ پرنم مجھے

مضطرب اے دل نہ ہونا ذوقِ طفلی کے لئے
تو بنا ہے تلخیٔ اشکِ یتیمی کے لئے

سایۂ رحمت ہے تو اے ظلِّ دامانِ پدر   غنچۂ طفلی پہ ہے مثلِ صبا تیرا گذر
رہنما ہے وادیٔ عالم میں تو مثلِ خضرؑ   تو تو ہے اک مظہرِ شانِ کریمی سربسر

ہے شہنشاہی جو طفلی تو ہما تاثیر ہے
تو نہ ہو تو زندگی اک قیدِ بے زنجیر ہے

عینِ طفلی میں ہلال آسا کمر خم کھا گئی   صبحِ پیری کی مگر بن کر یتیمی آ گئی
یادِ ناکامی اسے کیا جانے کیا سمجھا گئی   شعلۂ سوزِ الم کو اور بھی بھڑکا گئی

دم کے بدلے میرے سینے میں دمِ شمشیر ہے

زندگی اپنی کتابِ موت کی تفسیر ہے

جوششِ صرصر سے ہے اے بحر جولانی تری — اور قمر کے دم سے ہے ساری یہ طغیانی تری

کوہ و دریا سے ہے قائم شانِ سلطانی تری — اور شعاعِ مہر سے ہے خندہ پیشانی تری

نظمِ عالم میں نہیں موجود سازِ بے کسی

ہو گئی پھر کیوں یتیمی صیدِ بازِ بے کسی

کھینچ سکتا ہے مصور خندۂ گل کا سماں — اور کچھ مشکل نہیں اے برق تیری شوخیاں

صبح کا اختر نہیں کلکِ تصور پر گراں — اور ہی کچھ ہیں مگر میرے تبسم کے نشاں

یہ تبسم اشکِ حسرت کا نمک پروردہ ہے

دردِ پنہاں کو چھپانے کے لئے اک پردہ ہے

یادِ ایامِ سلف! تو نے مجھے تڑپا دیا — آہ اے چشمِ تصور تو نے کیا دکھلا دیا

اے فراقِ رفتگاں تو نے یہ کیا سمجھا دیا — دردِ پنہاں کی خلش کو اور بھی چمکا دیا

رو گیا ہوں دونوں ہاتھوں سے کلیجا تھام کر

کچھ مداوا اس مرض کا اے دلِ ناکام کر

آمد بوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ ارم — ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم

لذتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صبح دم — یا صدائے نغمۂ مرغِ سحر کی زیر و بم

رنگ کچھ شہر خموشاں میں جما سکتی نہیں

خفتگانِ کنج مرقد کو جگا سکتی نہیں

ہر گھڑی اے دل! نہ یوں اشکوں کا دریا چاہئے داستاں جیسی ہو ویسا سننے والا چاہئے

ہر کسی کے پاس یہ دکھڑا نہ رونا چاہئے آستاں اس کو تبسم ہاشمی کا چاہئے

چشم باطن کی نظر بھی کیا سبک رفتار ہے

سامنے اک دم میں درگاہِ شہِ ابرار ہے

اے مددگار غریباں! اے پناہِ بیکساں اے نصیرِ عاجزاں! اے مایۂ بے مایگاں

کارواں صبر و تحمل کا ہوا دل سے رواں کہنے آیا ہوں میں اپنے درد و غم کی داستاں

ہے تری ذاتِ مبارک حلِّ مشکل کے لئے

نام ہے تیرا شفا دکھے ہوئے دل کے لئے

بیکسوں میں تابِ جورِ آسماں ہوتی نہیں اِن دلوں میں طاقتِ ضبطِ فغاں ہوتی نہیں

کون وہ آفت ہے جو رہن بیاں ہوتی نہیں اک یتیمی ہے کہ ممنونِ زباں ہوتی نہیں

میری صورت ہی کہانی ہے دل ناشاد کی

ہے خموشی بھی مری سائل تری امداد کی

بزم عالم میں طراز مسند عظمت ہے تو بہر انساں جبرئیل آیۂ رحمت ہے تو

اے دیارِ علم و حکمت قبلۂ اُمت ہے تو ‏ ‏ ‏ اے ضیائے چشمِ ایماں زیبِ ہر مدحت ہے تو

درد جو انساں کا تھا وہ تیرے پہلو سے اُٹھا

قلزمِ جوشِ محبت تیرے آنسو سے اُٹھا

آبِ کوثر تشنہ کامانِ محبت کا ہے تو ‏ ‏ ‏ جس کے ہر قطرے میں سو موتی ہو وہ دریا ہے تو

طور پر چشمِ کلیم اللہ کا تارا ہے تو ‏ ‏ ‏ معنیٔ لیلیٰیں ہے تو مفہوم اَو ادنیٰ ہے تو

اُس نے پہچانا نہ تیری ذاتِ پُرانوار کو

جو نہ سمجھا احمدِ بے میم کے اسرار کو

دل رُبائی میں مثالِ خندۂ مادر ہے تو ‏ ‏ ‏ مثلِ آوازِ پدر شیریں تر از کوثر ہے تو

جس سے تاجِ عرش کو زینت ہو وہ گوہر ہے تو ‏ ‏ ‏ از پئے تقدیرِ عالم صورتِ اختر ہے تو

زیبِ حسنِ محفلِ اشرافِ عالم تو ہوا

تھی مؤخر گرچہ آمد پر مقدم تو ہوا

تیرا رتبہ جوہرِ آئینۂ لولاک ہے ‏ ‏ ‏ فیض سے تیرے رگِ تاکِ یقیں نمناک ہے

تیرے سایہ سے منور دیدۂ افلاک ہے ‏ ‏ ‏ کیمیا کہتے ہیں جس کو تیرے در کی خاک ہے

تیرے نظارے کا موسیٰ میں کہاں مقدور ہے

تو ظہورِ لَن تَرانی گوئے اوجِ طور ہے

دوپہر کی آگ میں وقتِ درودِ دہقان پر ہے پسینے سے نمایاں مہر تاباں کا اثر
جھلکیاں اُمید کی آتی ہیں چہرے پر نظر کاٹ لیتا ہے مگر جس وقت محنت کا ثمر

یا محمدؐ! کہہ کے اُٹھتا ہے وہ اپنے کام سے
ہائے کیا تسکیں اُسے ملتی ہے تیرے نام سے

وہ پناہِ دینِ حق وہ دامنِ غارِ حرا جو ترے فیضِ قدم سے غیرتِ سینا ہوا
وہ حصارِ عافیت وہ سلسلہ فاران کا جس کے ہر ذرے سے اُٹھی دینِ کامل کی صدا

فخر پابوسی سے تیری آسماں سا ہو گئی
یہ زمیں ہمپایۂ عرشِ معلّٰے ہو گئی

نظمِ قدرت میں نشاں پیدا نہیں بیداد کا شکوہ کرنا کام ہوتا ہے دلِ ناشاد کا
آگرا ہوں تیرے در پر وقت ہے امداد کا سرفرازی چاہیے بدلہ مری افتاد کا

آنہ سکتا تھا زباں تک بیکسی کا ماجرا
حوصلہ لیکن مجھے تیری یتیمی نے دیا

تھم ذرا بیتابیٔ دل! کیا صدا آتی ہے یہ لطفِ آبِ چشمۂ حیواں کو شرماتی ہے یہ
دل کو سوزِ عشق کی آتش سے گرماتی ہے یہ روح کو یادِ الٰہی کی طرح بھاتی ہے یہ

ہاں ادب اے دل بڑھا اعزاز مشتِ خاک کا

میں مخاطب ہوں جنابِ سیدِ لولاکؐ کا

اے گرفتارِ یتیمی اے اسیرِ قیدِ غم — تجھ سے ہے آرامِ جانِ سیدِ خیر الامم
نا اُمیدی نے کئے ہیں تجھ پہ کچھ ایسے ستم — چیرتا ہے دل کو تیرا نالۂ دردِ الم

تیری بے سامانیوں سے کیوں نہ میرا دل جلے
شرم سی آتی ہے تجھ کو بے نوا کہتے ہوئے

خرمنِ جاں کے لئے بجلی ترا افسانہ ہے — دل نہیں پہلو میں تیرے غم کا عشرت خانہ ہے
جس پہ بربادی ہو صدقے وہ ترا ویرانہ ہے — سہم جائے جس سے فرحت وہ ترا کاشانہ ہے

کانپتا ہے آسماں تیرے دلِ ناشاد سے
ہل گیا عرشِ معظم بھی تری فریاد سے

خون رلواتا ہے تیرا دیدۂ گریاں مجھے — کیوں نظر آتا ہے تو رہنِ غمِ پنہاں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تیرا حالِ بے ساماں مجھے — کیوں نظر آتا ہے تو مثلِ تنِ بے جاں مجھے

میری اُمت کیا شریکِ دردِ پیغمبر نہیں
کیا جہاں میں عاشقانِ شافعِ محشر نہیں

جس طرح مجھ سے نبوت میں کوئی بڑھ کر نہیں — میری اُمت سے حمیت میں کوئی بڑھ کر نہیں
امتحانِ صدق ہمت میں کوئی بڑھ کر نہیں — ہم مسلمانوں سے غیرت میں کوئی بڑھ کر نہیں

یہ دل وجاں سے خدا کے نام پر قربان ہیں
ہوں فرشتے بھی فدا جن پر یہ وہ انسان ہیں

جا کے یوں کہنا کہ اے گل ہائے باغ مصطفےٰ   تم سے برگشتہ نہ ہو جائے زمانے کی ہوا
عرصۂ ہستی میں از بہرِ حصول مدّعا   رشک صد اکسیر ہوتی ہے یتیموں کی دعا

یہ وہ جادو ہے کہ جس سے دیو حرماں دور ہو
یہ وہ نسخہ ہے کہ جس سے درد عصیاں دور ہو

یہ دعا میدان محشر میں بڑی کام آئے گی   شاہ شانِ کریمی سے گلے ملوائے گی
آتشِ عشق الٰہی سے تمہیں گرمائے گی   جو نہ موسیٰ نے بھی دیکھا تھا تمہیں دکھلائے گی

جس طرح مجھ کو شہید کربلا سے پیار ہے
حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

جوش میں اپنی رگ ہمت کو لانا چاہیئے   احمدی غیرت زمانے کو دکھانا چاہیئے
بندشِ غم سے یتیموں کو چھڑانا چاہیئے   مل کے اک دریا سخاوت کا بہانا چاہیئے

کام بے دولت نہ چرخ کہن چلتا نہیں
نخل مقصد غیر آب زر کبھی پھلتا نہیں

صید شاہینِ یتیمی کا پھڑکنا اور ہے   نوک جس کی دل میں چھبتی ہو وہ کانٹا اور ہے

علتِ حرماں نصیبی کا مداوا اور ہے — دردِ آزارِ مصیبت کا مسیحا اور ہے

پھونک دیتا ہے جگر کو دل کو تڑپاتا ہے یہ
نسخۂ مہر و محبت سے مگر جاتا ہے یہ

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اسلام کی — پہلے رکھی ہے یتیموں نے بِنا اسلام کی
کہہ رہی ہے اہلِ دل سے ابتدا اسلام کی — ہے یتیموں پر عنایت انتہا اسلام کی

تم اگر سمجھو تو یہ سو بات کی اک بات ہے
آبرو میری یتیمی کی تمہارے ہاتھ ہے

نوائے اذان

لکھا ہے ایک مغربیُ حق شناس نے — اہلِ قلم میں جس کا بہت احترام تھا
جولانگہ سکندرِ رومی تھا ایشیا — گردوں سے بھی بلند تر اس کا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے — دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
دنیا کے اس شہنشہ انجم سپاہ کو — حیرت سے دیکھتا فلکِ نیل فام تھا

آج ایشیا میں اس کو کوئی جانتا نہیں
تاریخ داں بھی اُسے پہچانتا نہیں

لیکن بلال وہ حبشی زادۂ حقیر
فطرت تھی جس کی نور نبوت سے مستنیر

جس کا امیں ازل سے ہوا سینۂ بلال
محکوم اس صدا کے ہیں شاہنشہ و وزیر

ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط
کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلوئے امیر

ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر

اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

فریادِ اُمّت

یہ مقبول نظم ابتدا میں "ابر گہربار" کے عنوان سے چوبیس سال پہلے شاعر نے انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں اور اپنے عالم خیال میں سردار دو عالم رسول اکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانۂ مبارک پر پڑھی تھی اس میں جس دلی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے اس سے کون متاثر نہ ہوگا۔

بند اول

دل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اسے لاؤں کیونکر
ہو چھپانے کی نہ جو بات چھپاؤں کیونکر

شوق نظارہ یہ کہتا ہے قیامت آئے
پھر میں نالوں سے قیامت نہ اٹھاؤں کیونکر

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ — پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیونکر

صدمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ — یہ بھی اک ناز ہے تیرا نہ اٹھاؤں کیونکر

زندگی تجھ سے ہے اے نارِ محبت میری — اشکِ غم سے ترے شعلوں کو بجھاؤں کیونکر

تجھ میں سو نغمے ہیں اے تارِ ربابِ ہستی — زخمۂ عشق سے تجھ کو نہ بجاؤں کیونکر

ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجھ کو — ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیونکر

بات ہے راز کی پر منہ سے نکل جائے گی
یہ مئے کہنہ خمِ دل سے اچھل جائے گی

بند دوم

آسماں مجھ کو بجھا دے جو فروزاں ہوں میں — صورتِ شمع سرِ گورِ غریباں ہوں میں

ہوں وہ بیمار جو ہو فکرِ مداوا مجھ کو — درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں

دیکھنا تو مری صورت پہ نہ جانا گلچیں — دیکھنے کو صفتِ نوگلِ خنداں ہوں میں

موت سمجھا ہوں مگر زندگیٔ فانی کو — نام آجائے جو اس کا تو گریزاں ہوں میں

دور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جلتا ہوں — یہ بھی جلنا ہے کوئی جس سے پشیماں ہوں میں

کنجِ عزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر — یہ وہی چیز ہے جس چیز سے نازاں ہوں میں

داغِ دل مہر کی صورت ہے نمایاں لیکن — ہے اسے شوق ابھی اور نمایاں ہوں میں

ضبط کی جا کے سُنا اور کسی کو ناصح　　اشک ٹرھ ٹرھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں میں ہوں

ہوں وہ مضموں کہ مشکل ہے سمجھنا میرا　　کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں

رند کہتا ہے ولی مجھ کو۔ ولی رند مجھے　　سُن کے اِن دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا　　اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب　　کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں

ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں　　کیا غضب آئے لگا ہوں سے جو پنہاں ہوں میں

دیکھ اے چشمِ عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ　　جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

مزرعِ سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
درد قرباں ہو جس دل پہ وہ ہے دل میرا

بندِ سُوم

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل　　التجائے اَرِنی سرخیٔ افسانۂ دل

یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی　　جادۂ راہِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل

ابرِ رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب　　جل گیا مزرعِ ہستی نہ اُگا دانۂ دل

حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا　　تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

عرش کا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکا اس پہ　　کس کی منزل ہے الٰہی مرا کاشانۂ دل

کچھ اسی کو ہے مزا دہر میں آزادی کا — جو ہوا قیدئی زنجیر پری خانۂ دل

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا — دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانۂ دل

تو سمجھتا نہیں اے زاہد ناداں اس کو — رشک صد سجدہ ہے اک لغزش مستانۂ دل

ہائے کیا جانئے اس گھر کا مکیں کیسا ہو — ہوں جو منصور سے دربان درخانۂ دل

خاک کے ڈھیر کو اکسیر بنا دیتی ہے — وہ اثر رکھتی ہے خاکستر پروانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

بند چہارم

آتی ہے اپنی سمجھ اور یہ مائل ہو کر — آنکھ کھل جاتی ہے انسان کی بے دل ہو کر

لوگ سودا کو یہ کہتے ہیں برا ہوتا ہے — عقل آئی مجھے پابند سلاسل ہو کر

آرزو کا کبھی رونا کبھی اپنا ماتم — اس سے پوچھے کوئی کیا دل نے لیا دل ہو کر

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ — اٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر

عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا — حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر

خلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دل — دیکھ ناداں ذرا آپ سے غافل ہو کر

طور پر تم نے جو اسے حضرت موسیٰ دیکھا — وہی کچھ قیس نے دیکھا پس محمل ہو کر

کیا کہوں بے خودیٔ شوق میں لذت کیا ہے — تو نے دیکھا نہیں زاہد کبھی غافل ہو کر
رہِ الفت میں رواں ہوں کبھی افتادہ ہوں — موج ہو کر کبھی خاک لبِ ساحل ہو کر
دمِ خنجر میں دمِ ذبح سما جاتا ہوں — جوہر آئینۂ خنجر قاتل ہو کر
وہ مسافر ہوں ملے جب نہ پتا منزل کا — خود بھی مٹ جاؤں نشانِ رہِ منزل ہو کر
ہے فروغِ دو جہاں داغِ محبت کی ضیا — چاند یہ وہ ہے کہ گھٹتا نہیں کامل ہو کر
دیدۂ شوق کو دیدار نہ ہو کیا معنی — آئے محفل میں جو دیدار کے قابل ہو کر
عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی توبہ — دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہو کر
مئے عرفاں سے مرا کاسۂ دل بھر جائے — میں بھی نکلا ہوں تری راہ میں سائل ہو کر

الدد سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

بندِ پنجم

لاکھ سامان ہے اک بے سر و ساماں ہونا — مجھ کو جمعیتِ خاطر ہے پریشاں ہونا
تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا
دل جو برباد محبت ہوا آباد ہوا — سازِ تعمیر تھا اس قصر کو ویراں ہونا

علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجھ کو ۔۔۔ لطف دیے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا

کبھی یثرب میں اویس قرنی سے چھپنا ۔۔۔ کبھی برقِ نگہ موسئے عمراں ہونا

قابِ قوسین بھی دعوائے ہے عبودیت کا ۔۔۔ کبھی چلمن کا اٹھانا کبھی پنہاں ہونا

لطف دیتا ہے مجھے مٹ کے تری الفت میں ۔۔۔ ہمہ تن شوق ہوائے عربستاں ہونا

یہی اسلام ہے میرا یہی ایماں میرا ۔۔۔ تیرے نظارۂ رخسار سے حیراں ہونا

خندۂ صبح تمنائے براہیم استی

چہرہ پرواز بہ حیرت کدۂ میم استی

بند ششم

حشر میں ابرِ شفاعت کا گہربار آیا ۔۔۔ دیکھ اے جنسِ عمل تیرا خریدار آیا

میں گیا حشر میں جب دم تو صدا یوں آئی ۔۔۔ دیکھنا دیکھنا وہ کافرِ دیندار آیا

پیرہن عشق کا جب حسنِ ازل نے پہنا ۔۔۔ بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا

لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے ۔۔۔ ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا

جوشِ سودائے محبت میں گریباں اپنا ۔۔۔ میں نے دیکھا تو نہ ہاتھوں میں کوئی تار آیا

عشق کی راہ میں اک سیر تھی ہر منزل پر ۔۔۔ نجد کا دشت کہیں مصر کا بازار آیا

میں نے سو گلشنِ جنت کو کیا اُس پہ نثار ۔۔۔ دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

لیں شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا
عرق شرم میں ڈوبا جو گنہ گار آیا

وہ مری شرم گنہ اور وہ سفارش تیری
ہائے اس پیار پہ کیا کیا نہ مجھے پیار آیا

ہے ترے عشق کا مے خانہ عجب مے خانہ
یعنی ہشیار گیا اور ہیں سرشار آیا

مَا عَرَفْنَا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری

قاب قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

بند ہفتم

لے چلا بحر محبت کا تلاطم مجھ کو
کشتیٔ نوح ہے ہر موجۂ قلزم مجھ کو

حسن تیرا مری آنکھوں میں سمایا جب سے
تیرگی ہے شعاع مہ و انجم مجھ کو

تیرے قربان میں اے ساقیٔ مے خانۂ عشق
میں نے اک جام کہا تو نے دئے خم مجھ کو

خاک ہو کر یہ ملا اوج تری الفت میں
کہ فرشتوں نے لیا بہر تیمم مجھ کو

گرد آسا سر دامن سے لگا پھرتا ہوں
حشر کے روز بھلا دو نہ کہیں تم مجھ کو

کوئی دیکھے تو ترے عاشق شیدا کا مزاج
حور سے کہتا ہے چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو

موت آجائے جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اٹھوں جو مسیحا بھی کہے قم مجھ کو

صفت نوک سر خار شب فرقت میں
چبھ رہی ہے نگہ دیدۂ انجم مجھ کو

خوف رہتا ہے یہ ہر دم کہ رہ یثرب سے
طور کی سمت نہ لے جائے تو ہم مجھ کو

تو نے آنکھوں کے اشارے سے جو تسکیں کر دی — شور محشر ہوا گلبانگ ترنم مجھ کو
اپنا مطلب مجھے کہنا ہے مگر تیرے حضور — چھوڑ جائے نہ کبھی تاب تکلم مجھ کو
ہے ابھی امتِ مرحوم کا رونا باقی — دیکھ اے بے خودئ شوق نہ کر گم مجھ کو

ہمہ حسرت ہوں سراپا غمِ بربادی ہوں
ستم دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

بند ہشتم

اے کہ تھا نوحؑ کو طوفاں میں سہارا تیرا — اور براہیمؑ کو آتش میں بھروسا تیرا
اے کہ مشعل تھا ترا عالمِ ظلمت میں وجود — اور نور نگہ عرش تھا سایا تیرا
اے کہ پرتو ہے ترے ہاتھ کا مہتاب کا نور — چاند بھی چاند بنا پا کے اشارا تیرا
گرچہ پوشیدہ رہا حسن ترا پردوں میں — ہے عیاں معنئ لولاک سے پایا تیرا
ناز تھا حضرتِ موسےٰ کو یدِ بیضا پر — سو تجلّی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا
چشمِ ہستی صفتِ دیدۂ اعمیٰ ہوتی — دیدۂ کن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا
مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر — غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

کیا کہوں امتِ مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

بند نہم

حالِ اُمت کا بُرا ہو کہ بھلا کہتے ہیں   صفتِ آئینہ جو کچھ ہے صفا کہتے ہیں

واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ   اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں

ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا   ہاں مگر وعظ میں دنیا کو بُرا کہتے ہیں

غیر بھی ہو تو اُسے چاہئے اچھا کہنا   پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو بُرا کہتے ہیں

فرقہ بندی کی ہوا تیرے گلستاں میں چلی   یہ وہ ناداں ہیں اسے بادِ صبا کہتے ہیں

آہ جس بات سے ہو فتنۂ محشر پیدا   یہ وہ بندے ہیں اُسے فتنہ رُبا کہتے ہیں

جن کی دینداری میں ہو آرزوئے زر پنہاں   آکے دھوکے میں انہیں راہ نما کہتے ہیں

لاکھ اقوام کو دنیا میں اُجاڑا اُس نے   تعصب کو مگر گھر کا دیا کہتے ہیں

خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں   مرض الموت ہے جو اُس کو دوا کہتے ہیں

مقصدِ لحمُكَ لحمِی یہ کھلی ان کی زباں   یہ تو اک راہ ہے تجھ کو بھی بُرا کہتے ہیں

تیرے پیاروں کا تو یہ حال ہو اے شافعِ حشر   میرے جیسوں کو تو کیا جانئے کیا کہتے ہیں

بغض للّٰہ کے پردے میں عداوت ذاتی   دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

جن کا یہ دیں ہو کہ اپنوں سے کریں ترکِ سلام   ایسے بندوں کو یہ بندے صلحا کہتے ہیں

قوم کے عشق میں ہو فکرِ کفن بھی نہ جسے   یہ اُسے بندۂ بے دامِ ہوا کہتے ہیں

وصل ہو لیلیٰ مقصود سے کیوں کر اپنا
اختر سوختۂ قیس ہے اختر اپنا

بند دہم

امرا جو ہیں وہ سنتے نہیں اپنا کہنا — سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا
ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا — ورنہ آتا تھا ہمیں حرف تمنا کہنا
دردمندوں کا کہیں حال چھپا رہتا ہے — اپنی خاموشی بھی تھی ایک طرح کا کہنا
شکوہ منت کش لب ہے کبھی منت کش چشم — میرا کہنا جو ہے رونا تو ہے رونا کہنا
قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے — یہ اگر راہ پہ آجائیں تو پھر کیا کہنا
بادۂ عیش میں سرمست رہا کرتے ہیں — یاد فرماں نہ ترا اور نہ خدا کا کہنا
ہم نے سو بار کہا قوم کی حالت ہے بری — پر سمجھتے نہیں یہ لوگ ہمارا کہنا

دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو تو برہم ہوکر
فقر تھا فخر ترا شاہ دو عالم ہوکر

بند یازدہم

اس مصیبت میں ہے اک تو ہی سہارا اپنا — تنگ آکر لب فریاد ہوا اپنا
ایسی حالت میں بھی اُمید نہ ٹوٹی اپنی — نام لیوا ہیں ترے تجھ پہ ہے دعوےٰ اپنا

فرقہ بندی سے کیا راہ نماؤں نے خراب — ہائے اِن مالیوں نے باغ اجاڑا اپنا

ہم نے سو راہ اخوت کی نکالی لیکن — نہ تو اپنا ہوا اپنا نہ پرایا اپنا

دیکھ اے نوح کی کشتی کے بچانے والے — آیا گرداب حوادث میں سفینا اپنا

اس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ سنے — اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانا اپنا

ہاں برس ابر کرم دیر نہیں ہے اچھی — کہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہونا اپنا

لطف یہ ہے کہ پھلے قوم کی کھیتی اس سے — ورنہ ہونے کو تو آنسو بھی ہے دریا اپنا

اب جو ہے ابر مصیبت کا دھواں دھار آیا — ڈھونڈھتا پھرتا ہے تجھ کو دلِ شیدا اپنا

یوں تو پوشیدہ نہ تھی تجھ سے ہماری حالت — ہم نے گھبرا کے مگر تذکرہ چھیڑا اپنا

زندگی تجھ سے ہے اے فخر براہیم اپنی — کر دعا حق سے کہ مشکل ہوا جینا اپنا

ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی — ہے انہیں لوگوں کی ہمت پہ بھروسا اپنا

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنا تجھ سے

بند دوازدہم

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے — یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے ہو عزت دین و دنیا — ہائے اے شافع محشر وہ دعا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے یک جان ہو امت ساری — ہاں بتا دے ہمیں وہ طرز وفا کون سی ہے
جس کے ہر قطرے میں تاثیر ہو یک رنگی کی — ہاں بتا دے وہ مے ہوش ربا کون سی ہے
قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا — ناقہ وہ کیا ہے وہ آواز درا کون سی ہے
اپنی فریاد میں تاثیر نہیں ہے باقی — جس سے دل قوم کا پگھلے وہ صدا کون سی ہے
سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں مگر — اپنی امید یہاں تیرے سوا کون سی ہے
اپنی کھیتی ہے اجڑ جانے کو اے ابر کرم — تجھ کو یاں کھینچ کے لائے وہ ہوا کون سی ہے
ہے نہاں جن کی گدائی میں امیری سب کی — آج دنیا میں وہ بزم فقرا کون سی ہے
تیرے قرباں کہ دکھا دی ہے یہ محفل تو نے — میں نے پوچھا جو اخوت کی بنا کون سی ہے

رہ اسی محفل رنگیں کی دکھا دے سب کو
اور اس بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو

ایک حاجی مدینے کے رستے میں

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور — اس بیابان یعنی بحر خشک کا ساحل ہے دور

ہم سفر میرے شکارِ دشنۂ رہزن ہوئے
بچ گئے جو ہو کے بیدل سوئے بیت اللہ پھرے

اس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی
موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی

خنجرِ رہزن اُسے گویا ہلالِ عید تھا
ہائے یثرب دل میں، لب پر کلمۂ توحید تھا

بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا
عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا

گو سلامت محمل شامی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی جاں کاہی میں ہے

خوف جاں رکھتا نہیں کچھ دشت پیمائے حجاز
ہجرت مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز

خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل
شوق کہتا ہے کہ مسلم ہے تو بے باکانہ چل

آہ یہ عقلِ زیاں اندیش کیا چالاک ہے
اور تاثر آدمی کا کس قدر بے باک ہے

شکوہ

یہ مشہور و مقبول نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے چھبیسویں سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں   ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم   قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم   نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذات قدیم   پھول تھا زیب چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم

شرط انصاف ہے اے صاحب الطاف عمیم   بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیت خاطر یہ پریشانی تھی

ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر   کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر   مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟

قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا؟

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی
اہل چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی
اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں
خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لئے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لئے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لئے

قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے

زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سُنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟ شہر قیصر کا جو تھا اُس کو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ کاٹ کر رکھ دئے کفار کے لشکر کس نے؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کونسی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی؟ اور تیرے لئے زحمت کشِ پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہاں گیر جہاں دار ہوئی؟ کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے
منہ کے بل گر کے ھُوَ اللہ اَحَد کہتے تھے؟

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز قبلہ رُو ہو کے زمیں بُوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے مئے توحید کو لیکر صفتِ جام پھرے
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے   نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے   تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں

ہم وفادار نہیں! تو بھی تو دلدار نہیں

اُمتیں اور بھی ہیں اُن میں گنہگار بھی ہیں   عجز والے بھی ہیں مستِ مئے پندار بھی ہیں

اُن میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں   سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بت صنم خانوں میں کہتے تھے مسلمان گئے   ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے

منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے   اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں؟

اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں ہیں اُن کے خزانے معمور   نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

طعنِ اغیار ہے رسوائی و ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلا لے بھی گئے آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

در لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی — نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی — اُمت احمد مرسل بھی وہی تو بھی وہی

پھر یہ آزردگیٔ غیر سبب کیا معنی!
اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی!

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا — بُت گری پیشہ کیا بت شکنی کو چھوڑا
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا — رسم سلمان و اویسِ قرنی کو چھوڑا

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشی رکھتے ہیں

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی — جادہ پیمائیٔ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی — اور پابندیٔ آئین وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے — اک اشارے میں ہزاروں کے لیئے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے — پھونک دی گرمیٔ رُخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں

ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں؟

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا — قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا

حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا — گھر یہ اُجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی

بے حجابانہ سُوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے — سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے

دور ہنگامۂ گلزار سے یک سو بیٹھے — تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے

پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے

برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز — لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز

مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز — تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے

طور مضطر ہے اسی آگ سے جلنے کے لئے

مشکلیں اُمّتِ مرحوم کی آساں کر دے — مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے

جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے — یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن — کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن — اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قُمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں — پتّیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں — ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں — کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینے میں — کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اِس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

چاک اُس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں — جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں

یعنی پھر زندہ نئے عہد وفا سے دل ہو پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہو

عجمی خُم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لَے تو حجازی ہے مری

جوابِ شکوہ

وہ نظم جو لاہور کے جلسۂ امداد مجروحین بلقان منعقدہ ۳۰ نومبر ۱۹۱۲ء میں پڑھی گئی ۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے خاک سے اُٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے

اُڑ کے آواز مری تا بہ فلک جا پہنچی
یعنی اس گل کی مہک عرش تلک جا پہنچی

جب مے درد سے ہو خلقت شاعر مدہوش آنکھ جب خون کے اشکوں سے بنے لالہ فروش
کشور دل میں ہو خاموش خیالوں کے خروش چرخ سے سوئے زمیں شعر کو لاتا ہے سروش

قید دستور سے بالا ہے مگر دل میرا

فرش سے شعر ہوا عرش پہ نازل میرا:

پیرِ گردوں نے کہا سُن کے کہیں ہے کوئی		بولے سیارے سرِعرش بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں! اہلِ زمیں ہے کوئی		کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

تھی فرشتوں کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا		عرش والوں پہ بھی کھلتا نہیں یہ راز ہے کیا
تا سرِعرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا		آگئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا

غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں
شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے		تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے
عالمِ کیف ہے دانائے رموزِ کم ہے		ہاں مگر عجز کے اسرار سے نامحرم ہے

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا.		اشکِ بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا.
ہے ہم آغوش فلک نعرۂ مستانہ ترا		کس قدر شوخ زباں ہے دلِ دیوانہ ترا

شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے

ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بکرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں   راہ دکھلائیں کسے رہ رو منزل ہی نہیں

تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں   جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں

ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

جس طرح احمد مختار ہے نبیوں میں امام   اس کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

کیا تمہارا ابھی نبی ہے وہی آقائے انام؟   تم مسلماں ہو؟ تمہارا ابھی وہی ہے اسلام؟

اُس کی امت کی علامت تو کوئی تم میں نہیں

مے جو اسلام کی ہوتی ہے وہ اس خم میں نہیں

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں   اُمتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں

بت شکن اُٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں   تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہے

قوم دنیا میں یہی احمدِ بے میم کی ہے

کشورِ ہند میں کلیۂ ناکام کا بت   عربستاں میں شفاخانۂ اسلام کا بت

اور لندن میں عبادت کدۂ عام کا بُت　　لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بت

بادہ آشام نئے بادہ نیا خُم بھی نئے

یعنی کعبہ بھی نیا بُت بھی نئے تم بھی نئے

وہ بھی دن تھے کہ یہی مایۂ رعنائی تھا　　نازشِ موسمِ گل لالۂ صحرائی تھا

جو مسلمان تھا اللہ کا سودائی تھا　　کبھی محبوب تمھارا یہی ہر جائی تھا

کسی یک جائی سے اب عہد غلامی کرلو

ملتِ احمد مرسل کو مقامی کرلو

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے　　ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

طبعِ آزاد پہ قیدِ رمضاں بھاری ہے　　تمہیں کہدو یہی آئین وفاداری ہے

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

جذب باہم جو نہیں محفل انجُم بھی نہیں

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو　　نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو

بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو　　بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو

ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کرکے

کیا نہ بیچوگے جو مل جائیں صنم پتھر کے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے　　نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے

میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے　　میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے

تھے تو آبا وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو؟

ہاتھ پر ہاتھ رکھے منتظرِ فردا ہو

کیا کہا بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور　　شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور

عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور　　مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں

جلوۂ طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک　　ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار؟　　مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار　　ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار؟

قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں

کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب　　زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب

نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب　　پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب

اُمرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے

زندہ ہے ملّتِ بیضا غربا کے دم سے

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی　　برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود　　ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مُسلم موجود

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود　　یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو

تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک　　عدل اُس کا تھا قوی لوثِ مراعات سے پاک

شجرِ فطرتِ مُسلم تھا حیا سے نم ناک　　تھا شجاعت میں وہ اک ہستیٔ فوق الادراک

خود گدازی نمِ کیفیتِ صہبایش بود

خالی از خویش شدن صورتِ مینایش بود

ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا　　اُس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا

جو بھروسا تھا اُسے قوتِ بازو پر تھا　　ہے تمہیں موت کا ڈر اُس کو خدا کا ڈر تھا

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو

پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے　　تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟

حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے　　تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

وہ زمانے میں مُعزز تھے مسلماں ہوکر

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

تم ہو آپس میں غضب ناک وہ آپس میں رحیم　　تم خطا کار و خطا بیں وہ خطا پوش و کریم

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم　　پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

تختِ فغفور بھی اُن کا تھا سریرِ کے بھی

یوں ہی باتیں ہیں کہ تم میں وہ حمیت ہے بھی؟

خودکشی شیوہ تمہارا وہ غیور و خوددار　　تم اُخوت سے گریزاں وہ اُخوت پہ نثار

تم ہو گفتار سراپا وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بہ کنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت اُن کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت اُن کی

علم حاضر بھی پڑھا زائرِ لندن بھی ہوئے
مثل انجم افق قوم پہ روشن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے
صفتِ طائر گم کردہ نشیمن بھی ہوئے
حال اُن کا مئے نو اور زبوں کرتی ہے
شب مہ سائے کی ظلمت کو فزوں کرتی ہے

قیس زحمت کشِ تنہائی صحرا نہ رہے
شہر کی کھائے ہوا بادیہ پیما نہ رہے
وہ تو دیوانہ ہے بستی میں رہے یا نہ رہے
یہ ضروری ہے حجابِ رُخِ لیلا نہ رہے
شوق تحریر مضامیں میں کھلی جاتی ہے
بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے

عہد نو برق ہے آتش زنِ ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوام کہن ایندھن ہے
ملّتِ ختمِ رسل شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی   کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
یعنی ہونے کو ہے کانٹوں سے بیاباں خالی   گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی

پیرہن کیوں فلکِ پیر کا عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی اُفق تابی ہے

اُمتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں   اور محرومِ ثمر بھی ہیں خزاں دیدہ بھی ہیں
سیکڑوں نخل ہیں کاہیدہ بھی بالیدہ بھی ہیں   سیکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں

نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا   تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا   غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

نخلِ شمع استی و در شعلہ دود ریشۂ تو
عاقبت سوز بُود سایۂ اندیشۂ تو

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے   نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے   پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے

عصر نو رات ہے دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا
غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا

تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری

زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری

ختم کاہے کو ہوا کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

ہو نہ افسردہ اگر ہل گئی تعمیر تری
رازِ توحید حکومت نہیں تفسیر تری

تو وہ سرباز ہے اسلام ہے شمشیر تری
نظمِ ہستی میں ہے کچھ اور ہی تقدیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

وسعت کون ومکاں ساز ہے مضراب ہے یہ — دہر مسجد ہے سراپا خم محراب ہے یہ
جام گردوں میں عیاں مثل مئے ناب ہے یہ — رُوح خورشید ہے خونِ رگ مہتاب ہے یہ

صوت ہے نغمۂ کن میں تو اسی نام سے ہے
زندگی زندہ اسی نور کے اتمام سے ہے

دشت میں دامن کہسار میں میدان میں ہے — بحر میں موج کی آغوش میں طوفان میں ہے
چین کے شہر مراقش کے بیاباں میں ہے — اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شان رفعنالک ذکرک دیکھے

مردم چشم زمیں یعنی وہ کالی دنیا — وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیٔ مہر کی پروردہ ہلالی دنیا — عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

انجم اس کے فلک اس کے ہیں زمیں اس کی ہے — کیا یہ اغیار کی دنیا ہے؟ نہیں اس کی ہے

سجدے مسجود ہوں جس کے وہ جبیں اس کی ہے
وہ ہمارا ہے امیں قوم امیں اس کی ہے

طوف احمد کے امینوں کا فلک کرتے ہیں
یہ وہ بندے ہیں ادب جن کا ملک کرتے ہیں

شل بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا

شوق وسعت ہے تو ذرے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

بول اس نام کا ہر قوم میں بالا کر دے
اور دنیا کے اندھیرے میں اجالا کر دے

دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے
سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے

نغمۂ امید تیرے بربط دل میں نہیں
ہم سمجھتے ہیں یہ لیلیٰ تیرے محمل میں نہیں

گوش آواز سرود رفتہ کا جویا ترا
اور دل ہنگامۂ حاضر سے بے پروا ترا

قصۂ گل ہم نوایان چمن سنتے نہیں
اہل محفل تیرا پیغام کہن سنتے نہیں

اے درائے کاروان خفتہ پا خاموش ہو
ہے بہت یاس آفریں تیری صدا خاموش ہو

زندہ پھر وہ محفل دیرینہ ہو سکتی نہیں

شمع ہے محفل شب دوشینہ ہو سکتی نہیں

ہمنشیں مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں | اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

نبض موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے | اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے

حق نے عالم اس صداقت کیلئے پیدا کیا | اور مجھے اس کی حفاظت کیلئے پیدا کیا

دہر میں غارت گر باطل پرستی میں ہوا | حق تو یہ ہے حافظ ناموس ہستی میں ہوا

میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے | میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

قسمت عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے | جس کی تابانی سے افسون سحر شرمندہ ہے

آشکارا ہیں مری آنکھوں پر اسرار حیات | کر نہیں سکتی مجھے مایوس پیکار حیات

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے | ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار | فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

ہاں یہ سچ ہے چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں | اہل محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں

یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے | میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سامنے رکھتا ہوں اس دور نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینہ میں فردا کو میں

شمع اور شاعر

اس نظم بے بدل میں رنگین خیال شاعرِ اسلام کے حال و ماضی کا نقشہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے اور مستقبل کے توقعات کی خوش آئند تفسیر کی ہے مصرع مصرع میں وہ معانی و مطالب مخفی ہیں کہ ان پر جس قدر غور کی جائے مفہوم وسیع ہوتا چلا جائے گا۔ اکثر اربابِ بینش کے نزدیک یہ بیش بہا نظم اختراع فائقہ کا ایک مکمل نمونہ ہے۔

(شاعر)

بندِ اوّل

دوش می گفتم بہ شمعِ منزلِ ویرانِ خویش — گیسوئے تو از پرِ پروانہ دارد شانہ
در جہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا استم — نے نصیبِ محفلے نے قسمتِ کاشانۂ
مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم — در طوافِ شعلہ‌ام بالے نزد پروانۂ
می طپد صد جلوہ در جانِ امل فرسودِ من — بر نمی خیزد ازیں محفل دلِ دیوانۂ

از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی
کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی

شمع

بند دوم

مجھ کو جو موجِ نفس دیتی ہے پیغامِ اجل — لب اسی موجِ نفس سے ہے نوا پیرا ترا

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز — تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

گریہ ساماں میں کہ میرے دل میں ہے طوفانِ اشک — شبنم افشاں تو کہ بزمِ گل میں ہو چرچا ترا

گل بہ دامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح — ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں — شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے — انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ نے صہبا ترا

اور ہے تیرا شعار آئینِ ملت اور ہے — زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائیِ بت خانہ ہے — کس قدر شوریدہ سر ہے شوقِ بے پروا ترا

قیس ہوں پیدا تری محفل میں یہ ممکن نہیں — تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا

اے درِ تابندہ اے پروردۂ آغوشِ موج — لذتِ طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا

اب نوا پیرا ہے کیا گلشن ہوا برہم ترا
نے محل تیرا ترنم نغمہ بے موسم ترا

بند سوم

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لیکے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اُٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

آہ! جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائیِ سوزِ تمام آیا تو کیا

پھول بے پروا ہیں تو گرمِ نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آوازِ درا ہو یا نہ ہو

بندِ چہارم

شمعِ محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

رشتۂ الفت میں جب اُن کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

شوقِ بے پروا گیا فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آشامی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے

خیر تو ساقی سہی لیکن پلائے گا کسے؟
اب نہ وہ مے کش رہے باقی نہ میخانے رہے

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اُسے
کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

بندِ پنجم

جنکے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی — شہر اُن کے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں
سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی — وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں
دہر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے — موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں
خود تجلّی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی — وہ نگاہیں نا اُمیدِ نورِ ایمن ہو گئیں
اُڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں — دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں
وسعتِ گردوں میں تھی اُن کی تڑپ نظارہ سوز — بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں
دیدۂ خوں بار ہو منت کشِ گلزار کیوں — اشکِ پیہم سے نگاہیں گل بداماں ہو گئیں

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمید کی

بندِ ششم

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز — بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش
نقدِ خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی — پھر دکاں تیری ہے لبریزِ صدائے ناؤنوش

ٹوٹنے کو ہے طلسمِ ماہ سیمایانِ ہند — پھر سلیمیٰ کی نظر دیتی ہے پیغامِ خروش
پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز — دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش
نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں — ہے سحر کا آسماں خورشید سے مینا بدوش
در غمِ دیگر بسوز و دیگراں را ہم بسوز — گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش
کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری — ہاں سنا دے محفلِ ملّت کو پیغامِ سروش

آنکھ کو بیدار کر دے وعدۂ دیدار سے
زندہ کر دے دل کو سوزِ جوہرِ گفتار سے

بندِ ہفتم

ملک ہاتوں سے گیا ملّت کی آنکھیں کھل گئیں — سُرمۂ چشم دشت میں گردِ رمِ آہو ہوا
رہزنِ ہمّت ہوا ذوقِ تنِ آسانی ترا — بحر تھا صحرا میں تو گلشن میں آیا جو ہوا
اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی — چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروانِ بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات — یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ — زندگی کیسی جو دل بے گانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملّت کی جمعیت سے تھی — جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

بند ہشتم

پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ
یعنی اپنی مے کو رُسوا صورتِ مینا نہ کر

خیمہ زن ہو وادیِ سینا میں مانندِ کلیم
شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ کر

شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم
صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ کر

تو اگر خوددار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر

کیفیت باقی پُرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر
تو عصا اُفتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر

ہاں اُسی شاخِ کہن پر پھر بنالے آشیاں
اہلِ گلشن کو شہیدِ نغمۂ مستانہ کر

اِس چمن میں پیروِ بُلبل ہو یا تلمیذِ گل
یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

بند نہم

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو رہ رو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا؟ ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں میں کبھی قیس تو لیلا بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو خوف باطل کیا کہ ہے غارت گر باطل بھی تو

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

بند دہم

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہ فاراں کا سکوت اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے
دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقریر میں کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے
پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

بند یازدہم

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار — نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز — اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
دیکھ لو گے سطوت رفتار دریا کا مآل — موج مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیمانِ سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا سامانِ طیور — خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

حیاتِ ملّیہ

نواپرداز اسرارِ حیات نے یہ زندگی فزا اشعار انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھے تھے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

سکوت شام سے تا نغمۂ سحرگاہی — ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

کشاکشِ زم و گرما تپ و تراش و خراش — ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی

مقام بست و شکست و فشرد و سوز و کشید — میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

خضرِ راہ

ترجمانِ حقیقت کے حافظہ و ذہن کی رسائی اور کمالِ فن کی خوبی تھی کہ یہ حقائق آگیں اور دل فروز دل نشیں نظم انجمن حمایت اسلام لاہور کے سینتیسویں سالانہ جلسہ میں لکھ کر یا طبع کرا کے نہیں بلکہ زبانی پڑھی حسبِ معمول سامعین کی تعداد ہزاروں تک تھی دنیائے اسلام کے اضطراب سے متاثر ہو کر جلسہ نے آنسو کے دریا بہا دیئے ؎

شاعر

بند اوّل

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر — گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

شب سکوت افزا ہوا آسودہ - دریا نرم سیر — تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب

جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار — موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب

رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر — انجم کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر — جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل — چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

بند دوم

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار — جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
کشتیِ مسکین، و جانِ پاک و دیوارِ یتیم — علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد — زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے سلطنت کیا چیز ہے — اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش
گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی — فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ ناؤ نوش
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک — نوجواں اقوام نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ — خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

خضر

بند سوم

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے — یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں | گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہوئے بے پروا خرام | وہ گدا بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح | یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب | جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں | اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش | اور تو اے بے خبر زنجیریٔ کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

زندگی کا راز

بند چہارم

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی | ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ | جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے | سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ | جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب | اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے

اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

بندِ پنجم

پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
ہو صداقت کے لئے مرنے کی جس دل میں تڑپ

اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار

تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب

تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار

رات کے تاروں میں اپنا رازداں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

سلطنت کی حقیقت

بندِ ششم

سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
آبتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْك

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

نوعِ انساں کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے یہ — شاہ راہِ فطرۃ اللہ میں یہ ہے غارت گری

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں — توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن — "تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری

مجلسِ آئینِ اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمئ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

سرمایہ و محنت

بندِ ہفتم

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰت

ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

بند ہشتم

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیداریِ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد ہو

دنیائے اسلام

بند نہم

کیا سُناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں — مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ — جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستاں سے پارس — وہ مئے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی — ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند

می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

بند دہم

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں — حق ترا چشمے عطا کردست غافل در نگر

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست — مور بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات — ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو — ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بہ خاکِ کاشغر

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش.
اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش

بند یازدہم

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اُس خواب کی تعبیر دیکھ

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہانِ پیر دیکھ

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

طلوعِ اسلام

بندِ اوّل

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوارا تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

تڑپ صحنِ چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی

وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

بندِ دوم

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ربود آں ترکِ شیرازی دلِ تبریز و کابل را — صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی — جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے — کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینہ میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے

مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

بندِ سوم

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا — تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی — جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر — نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا — کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

بند چہارم

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی   اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا   نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک   ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی
گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا   بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے   وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے   تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں   کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

بند پنجم

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں   جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ولایت بادشاہی علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بیتابے

بند ششم

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کے گہر نکلے

غبارِ رہ گزر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں — اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

بندِ ہفتم

تو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا — خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے — نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر — شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بنکے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے — گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

بندِ ہشتم

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے — قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خروش آموزِ بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے

پھر اُٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
پس از مدت گزار افتاد بر ما کاروانے را

بند نہم

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد

کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد

سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں سازدہ ساقی
کہ خیلِ نغمہ پردازاں قطار آمد قطار آمد

کنار از زاہداں برگیر و بے باکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد

بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد

دگر شاخِ خلیل از خونِ ما نمناک می گردد
بہ بازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد

سرِ خاک شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم   کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

تمت بالخیر

[illegible] پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن میں چھپا

سلسلہ صفحۂ اوّل

ایک قابل اور ممتاز عہدہ دار ہیں، ہر دلعزیز ہیں، سر رشتۂ فینانس کے مددگار ہیں اور سرکاری فرائض مفوضہ بے لوثی اور انہماک کے ساتھ انجام دیتے ہیں لیکن ہمیں اس کی مطلق خبر نہ تھی کہ وہ علمی مشاغل کے لئے یوں وقت نکالتے ہوں گے اور ادبیات میں بھی ایسا ذوق سلیم اور فلسفہ کا اتنا شعور صحیح رکھتے ہوں گے۔ ہمیں بے حد مسرت ہے کہ وہ گرم دل اور رنگین فکر برگسان کی تصانیف کریٹیو ایوولیوشن وغیرہ Creative Evolution کا نہایت خوبصورتی کے ساتھ اردو زبان میں ترجمہ کر رکھے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ کلیاتِ اقبال مرتب کرنے کی زحمت انھوں نے مادی منفعت یا شوق شہرت کے واسطے گوارا نہیں فرمائی بلکہ قوم کی ترقی اور عروج ان کا خاص مطمح نظر ہے جو ہر آئینہ لائق آفریں اور قابل ستائش ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے محکم یقین، پیہم عمل، اور فاتح عالم محبت کی شمشیروں سے جہادِ زندگی میں مصروف رہ کر دوسروں کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کی ہے۔ مبارک ہیں وہ افراد جو ان کے مانند بلند نصب العین رکھ کر اعلائے کلمۃ اللہ اور ابنائے ملک کی خاموش خدمت پر اس طرح مستعد اور آمادہ رہتے ہیں۔"

ضمنی مدح کی یہ چند سطریں برادر ممدوح کے نزدیک "ناگفتنی" تھیں جن کو میں نے ناظرین سے محض ان کا تعارف کرانے کے لئے "گفتنی" میں تبدیل کر دیا ہے وہ تو اپنی تعریف سن کر یہ پڑھا کرتے ہیں۔

كَفَيْتَ أَذًى يَا مَنْ يَعُدُّ مَحَاسِنِي ... عَلَانِيَةً هٰذَا وَلَمْ تَدْرِ مَا بَاطِنِي

(م - ع - ص)